خط
میں پوسٹ
کی ہوئی
دوپہر
Re.1
PAKISTAN پاکستان
کہانیاں
مظہر الاسلام

مظہر الاسلام ۴ ، اگست ۱۹۴۹ء کو خانیوال کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں پیرو وال میں پیدا ہوئے، جہاں اس وقت ان کے والد محکمہ جنگلات میں تعینات تھے۔ مظہر الاسلام نے بچپن اپنے آبائی شہر وزیر آباد میں گذارا اور مشن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا کچھ عرصہ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں زیر تعلیم رہے مگر پھر والد کی وفات کے بعد ۱۹۶۷ء میں مستقل طور پر اسلام آباد میں رہائش اختیار کر لی جہاں سے انہوں نے اردو ادب میں ایم ۔ اے کیا ۔ کچھ عرصہ ٹی وی، وزارت تعلیم اور ریڈیو سے وابستہ رہنے کے بعد لوک ورثے کے قومی ادارے میں ملازمت اختیار کر لی جہاں آج کل وہ بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

لوک ورثہ اشاعت گھر۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۸۴، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر

کہانیاں

مظہر الاسلام

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۱ء

پبلشرز ــ نیاز احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

تعداد : ایک ہزار

قیمت ۹۹/- روپے

آر۔آر پرنٹرز، لاہور

ISBN 969-35-0111-X

ترتیب

سفرکہانیاں

کہنے لگی: تم نے اپنی کہانیوں کی اس کتاب کا پھر عجیب و غریب سا نام رکھ دیا ہے
"خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر"

میں نے کہا: مجھے ایسے ہی نام سوجھتے ہیں میرے محترم دوست نیاز احمد صاحب جو کہ میرے پبلشر بھی ہیں ہر بار مجھ سے اس بات پر ناراض ہو جاتے ہیں ۔ اس سے پہلے جب میں نے اپنی کہانیوں کے تیسرے مجموعہ "گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو" کا ٹائیٹل ڈیزائن کیا تو سیاہ رنگ دیکھ کر نیاز صاحب نے کہا تھا آئندہ اگر تم نے اپنی کتاب کے ٹائیٹل کے لئے سیاہ رنگ تجویز کیا تو میں تمہاری کتاب نہیں چھاپوں گا ۔

کہنے لگی: اب کی بار نیاز صاحب پھر ناراض ہوں گے کیونکہ کتاب کا نام بالکل مختلف سا ہے اور تم نے ٹائیٹل بھی ایسا ہی ڈیزائن کیا ہو گا۔

میں نے کہا: اب کی بار ٹائیٹل میں سیاہ رنگ نہیں دوپہر کا رنگ ہے ۔

کہنے لگی: بھلا کبھی دوپہر بھی خط میں پوسٹ کی جا سکتی ہے ۔

میں نے کہا: کیوں نہیں، ایک شام، دوپہر، پورا سال، ساری عمر کچھ بھی کسی دوسرے

کو خط میں پوسٹ کیا جا سکتا ہے۔

کہنے لگی: تم نے "خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر" کے نام سے ایک کہانی بھی تو لکھی تھی

میں نے کہا: وہ کہانی اس کتاب میں شامل نہیں

کہنے لگی: کیوں؟

میں نے کہا: مجھے اچھا نہیں لگتا، ہر کہانی کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ کسی ایک کہانی کے نام پر کتاب کا نام رکھ دینے سے لوگ ساری کتاب کو ایک ہی کہانی کے حوالے سے دیکھتے ہیں جب کہ دوپہر تو ایک استعارہ ہے، علامت ہے، حوالہ ہے، دوپہر ایک بچہ ہے، مرد ہے، کوئی لڑکی ہے۔ وقت ہے، دکھ ہے، پیار ہے، نیند ہے، خواب ہے۔

کہنے لگی: (اُس کے گلے میں ہنسی کھنکی) تم بھی عجیب عجیب باتیں سوچتے ہو۔ دوپہر لڑکی

میں نے کہا: ایسی دوپہر ہوتی ہے جو بالیاں پہنتی ہے، بال بناتی ہے، موتیوں کا ہار اور شام رنگ چوڑیاں پہنتی ہے۔ تم بھی تو ایک دوپہر ہو۔ ہلکے براؤن رنگ کی۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر جب تیز دھوپ ہر چیز کو بھون ڈالتی ہے، چڑیا گرمی کے مارے ہلکان ہوئی پھرتی ہے اور سایہ نام کو نہیں ہوتا۔

کہنے لگی: تم تو مجھے جانتے بھی نہیں کہ میں کون ہوں تم تو کبھی مجھ سے ملے بھی نہیں۔ میں کبھی تمہارے سامنے نہیں آئی، تم نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں بھی ایک دوپہر ہوں۔

میں نے کہا: مجھے تم سے دوپہر کی مہک آتی ہے۔ میں نے تمہارا خیال اپنے ذہن پر لکیر لیا ہے تم نے دیکھا ہوگا بچوں کی ڈرائنگ کی کاپی پر نمبر لگے ہوتے

ہیں۔ جب وہ ایک نمبر سے دوسرے نمبر تک لکیر کھینچتے ہیں تو کوئی نہ کوئی شکل بن جاتی ہے۔ بس میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے تمہاری باتوں کو جوڑ لیا ہے اور جو نقش بنا ہے وہ ایک جھلسا دینے والی دوپہر کا ہے۔ بالکل اُس دوپہر جیسا جب میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ گلیاں دُھوپ سے بھری ہوئی تھیں اور میرے پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔

کہنے لگی: تمہارے پاؤں تو جل گئے ہوں گے (اُس کی آواز میں اداسی بھر گئی)

میں نے کہا: گلیوں کی سولنگ کوئلوں کی طرح دہک رہی تھی۔ اب ۳۰ سال گزر جانے کے بعد بھی میرے پاؤں کے تلوؤں پر اُس دوپہر کا نشان موجود ہے۔ میں نے اُس دوپہر کو سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ساری زندگی وہ دوپہر میرے بہت کام آئی اُس دوپہر کی وجہ سے مجھے فراق کی دھوپ میں، جدائی کی لمبی دوپہروں میں، حالات کی تنگ گلیوں میں، انتظار کے تپتے صحرا کی ریت پر ننگے پاؤں چلنا آ گیا۔ اُسی دوپہر سے مجھے دُکھ کی چاٹ پڑی۔ اب بھی وہ دوپہر دُکھ کی چھتری کی طرح میری عمر کے کسی کونے میں پڑی ہے۔

کہنے لگی: دُکھ کی چھتری؟

میں نے کہا: دُکھ کی چھتری ہوتی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں میرے گھر میں کبھی کوئی چھتری نہیں تھی۔ تیز دھوپ اور موسلا دھار بارش میں بھی میں بغیر چھتری کے پیدل سکول جایا کرتا تھا۔ جب میں اُس کے گھر کے قریب سے گزرتا تو اُس کی طرف ضرور دیکھتا۔ وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑی رہتی تھی — کسی چھتری کی طرح۔ دشمنوں نے رات کو اُس کے باپ کے کھیتوں اور گھر کو آگ لگا دی تھی۔ خاندان کے صرف دو افراد زندہ بچے تھے۔ وہ

بُری طرح جل گئی تھی ۔ اُس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا اس لئے کوئی بھی اُس کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ وہ جوان تھی اور کبھی خوبصورت بھی، اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی بے لبسی تیرتی رہتی تھی۔ مَیں جب بھی اُس کی طرف دیکھتا۔ اُس کا خیال دُکھ کی چھتری کی طرح مجھ پر سایہ کر لیتا۔ دھوپ کی شدت کم ہو جاتی۔ مَیں نے دُکھ کی اس چھتری کو بھی سنبھال کر اپنے من میں رکھ لیا۔ بعد میں یہ چھتری بھی میرے بہت کام آئی، انتظار کی موسلا دھار بارشیں اور فراق کی لمبی دوپہریں۔ مَیں نے اسی دُکھ کی چھتری کے سائے میں گزار دی ہیں۔ اس چھتری نے مجھے دُکھ کی لذت سے آشنا کیا۔ میرے اندر دردمندی پیدا کی۔ مجھے رونا سکھایا۔

کہنے لگی : جن لوگوں کے پاس دُکھ کی چھتری نہیں ہوتی

مَیں نے کہا : اُن کا دل درد سے آشنا نہیں ہوتا۔ وہ موسموں کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتے زندگی کا زیادہ تر حصہ دُکھ کے موسموں کا ہوتا ہے۔ میری تو ساری زندگی دُکھ اور انتظار سے رنگی ہوئی ہے اور میرا من دُکھ کی چھتریوں سے بھرا ہوا ہے ۔۔ دُکھ کی چھتری پاس ہو تو تپسیا کی لمبی دوپہر آسانی سے کٹ جاتی ہے۔ ریاضت کی لمبی راتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اپنے آپ پر کنٹرول آجاتا ہے۔ بدن کا روزہ رکھنا سہل ہو جاتا ہے ۔ بدن کا روزہ لکھنے کے لئے بہت ضروری ہے آنکھ محبت کے جام پیئے مگر بدن روزے سے ہو۔۔ تخلیق کا روہی ہوتا ہے۔

کہنے لگی : اس سے کیا ہوتا ہے

مَیں نے کہا : کہانی، نظم، تصویر اور تحریر میں اثر پیدا ہوتا ہے ۔۔ بدن کا روزہ نہ

رکھا جائے تو محبت کرنے کا سلیقہ نہیں آتا ۔ کہانی کے لباس پر سچائی کے پھول نہیں کھلتے ۔

کہنے لگی : یہ تو بہت مشکل ہے

میں نے کہا : مشکل تو ہے ۔ آنکھیں محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں اور سارا بدن تیز دھوپ میں جل رہا ہو ۔ کسی درخت کا سارا پھل ڈال پر ہی پک جائے وہ پھل سے بھرا ہوا ہو کوئی آندھی یا طوفان پھل گرا نہ سکے ۔ کوئی پھل توڑ نہ سکے ۔ درخت کو محبت (پھل) کا سارا موسم اسی طرح گزارنا پڑے ۔

کہنے لگی ، یہ تو ایسے ہے آپ کو شدید پیاس لگی ہو آپ کی زبان پر کانٹے چُبھ رہے ہوں آپ کسی گنگناتی ہوئی ندی کے کنارے کنارے چلیں آنکھوں میں شفاف میٹھے پانی کی ٹھنڈک مہک رہی ہو مگر آپ ایک اوک پانی نہ پیئیں ۔

میں نے کہا : اسی تپسیا اور ریاضت سے تخلیق میں زرخیزی آتی ہے ۔ یقین پیدا ہوتا ہے ۔ انسان پتی پتی بکھرتا ہے ۔ مر کر جینا پڑتا ہے ۔ اپنے آپ سے جلاوطنی اختیار کرنا پڑتی ہے تب محبت کی فصل پکتی ہے ۔ پھر اس فصل کے بچاؤ کے لیے دل کے کھیت کے کنارے بجو کا کھڑا کرنا پڑتا ہے ۔

کہنے لگی ، اس طرح تو انسان دوسروں سے کٹ جاتا ہے

میں نے کہا : کبھی کبھی مجھے انسانوں سے خوف آنے لگتا ہے ۔ میں فاصلہ اوڑھ لیتا ہوں ۔ تنہائی میں بیٹھ کر سچ کے دھاگے سے زندگی کا پھٹا ہوا لباس سیتا ہوں ۔ اندھیری رات میں دُکھ کے دِیئے کی مدھم لَو دل میں خیال بوتی ہے ۔ دل کو الہام ہوتا ہے ۔ دل میں کہانی کی پازیب کی آواز جھکتی

ہے۔

کہنے لگی: یہ تو پھر ایسے ہوا ناکہ تیز دھوپ نکلی ہو اور بارش بھی ہو رہی ہو

میں نے کہا: بڑی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ دھوپ اور بارش ایک ساتھ۔ بیک وقت جدائی اور ملاپ کا وقت۔ پیاسی مٹی سیراب بھی ہوتی ہے۔ اور جدائی کی مہک بھی پھیلاتی ہے بالکل ایسی ہی مہک تم سے بھی آتی ہے۔ ایسی ہی ایک دوپہر میرے ایک دوست نے دریا میں ڈوب کر خودکشی کر لی تھی ــ مجھے اچھی طرح یاد ہے

کہنے لگی: چپ کیوں ہو گئے ہو

میں نے کہا: آج سے ۳۵ سال پہلے جب ہم کاغذ کی کشتیاں بنا کر چھوٹے سے برتن میں پانی ڈال کر کھیل رہے تھے تو اُس کی کشتی ڈوب گئی تھی۔

کہنے لگی، کس کی؟

میں نے کہا، وہ جو چھوٹی سی عمر میں بڑی بڑی باتیں کرتی تھی۔ اُسے سب سے زیادہ کہانیاں یاد تھیں بات کرتے وقت تھوڑا سا ناک چڑھاتی تھی۔ اب پتہ چلا ہے کہ وہ خود بھی ایک دوپہر تھی جواب بھی میری یادوں کے کسی کونے میں کاغذ کی گیلی کشتی کی طرح پڑی ہے۔

کہنے لگی: بہت سی دوپہریں تمہارے دل میں ٹھہر گئی ہیں۔

میں نے کہا، ان میں سے کچھ دوپہریں تو میرے دل میں پھول بن کر اُگ پڑی ہیں مگر کچھ آنسو بن کر میرے دل پر موسلادھار بارش کی طرح برستی ہیں اور کچھ دوپہریں میرے من کی دیواروں میں یوں پڑی ہیں جیسے کبھی سیاسی قیدی جیل کی دیواروں میں اپنے خط اور نظمیں چھپا کر رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے جب نئی جیل بن جانے کی وجہ سے میرے شہر کی پُرانی جیل مسمار کی جا رہی

بھی تو گری ہوئی دیواروں سے دوپہریں چینخ کی طرح گرتی تھیں ۔
مجھے گولیوں سے چھلنی وہ دوپہر بھی یاد ہے جب ایک لڑکی کے بھائیوں
نے لڑکی کے محبوب کو قتل کر دیا تھا اور اُس کی لاش تپتی ہوئی سڑک پر
پڑی تھی۔ کئی سال گزر جانے کے باوجود یہ دوپہر بھی میرے پاس پڑی
ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اگر اُس لڑکی کا پتہ مجھے مل جائے تو میں
یہ دوپہر خط میں ڈال کر اُسے پوسٹ کردوں ۔ میرے پاس ایسی
کئی دوپہریں پڑی ہیں جو پوسٹ کرنے والی ہیں ۔ میں نے ٹی وی پر
امریکی عورتیں دیکھی تھیں جو محاذِ جنگ پر جانے والے اپنے شوہروں ،
بیٹوں ، بھائیوں اور محبوب کو الوداع کہنے بحری اڈے پر آئی ہوئی
تھیں اُن کی آنکھوں میں بھی میں نے دوپہر دیکھی تھی میرا جی چاہتا ہے
میں یہ دوپہر خط میں ڈال کر امریکہ کے صدر کو پوسٹ کردوں ۔ ایسی ہی ایک
دوپہر میں عراق کے صدر کو بھی پوسٹ کرنا چاہتا ہوں ۔ ایک دوپہر اور
بھی ہے لیکن سمجھ نہیں آتا کہ وہ کس کو پوسٹ کروں وہ دوپہر میں نے
داتا گنج بخشؒ کے مزار پر دیکھی تھی ۔ وہ رو رو کر فریاد کر رہی تھی
داتا کوئی میری بیٹی اُٹھا کر لے گیا ہے مجھے میری بیٹی ملا دے میں تمہارے
مزار پر جھاڑو دوں گی ۔

کہنے لگی : (آواز میں اکتاہٹ) کیا تم نے کبھی کوئی خوبصورت دوپہر بھی دیکھی ہے ؟

میں نے کہا : ایک بار میں نے ایک خوبصورت دوپہر دیکھی تھی ۔ براؤن رنگ کی اُجلی
نکھری ہوئی خود پسند دوپہر ۔۔۔ اُسے خود بھی احساس تھا کہ وہ ایک
خوبصورت دوپہر ہے ۔ اُس میں سے کچے خواب کی خوشبو آرہی تھی اُس کی
سفید کلائی پر ایک ڈارک براؤن نشان تھا ۔۔۔ اُس نے حرف ایکبو(؟)

پہن رکھی تھی۔ آنکھیں سوڈے کی بنٹے والی بوتل کی طرح کھل جانے کو
تیار اُس کا سینہ پیاسی چڑیا کی طرح ہلکان ہو رہا تھا۔ اُس کے من میں
دُھوپ اور کمر پر ہلکی سی چھاؤں تھی۔ وہ دوپہر بھی میرے دل میں
پڑی ہے۔ اگر مجھے پتہ چل جائے کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے
تو میں یہ دوپہر اُسے پوسٹ کر دوں۔

کہنے لگی: کیا تم نے خط میں پوسٹ کی ہوئی کوئی دوپہر دیکھی ہے؟

میں نے کہا: ہاں — لفافہ کھولا تو اُس میں سے جو کاغذ نکالا وہ خالی تھا —
سفید — کورا — وہ خط کسی سُونی گلی کی طرح تھا۔ وہ کسی ایسے
گھر کی کھڑکی کی طرح تھا جو گھر کے دیر تک بند پڑا رہنے کی وجہ سے
جام ہو جاتی ہے کھڑکی کے پٹ فریم سے جُڑ جاتے ہیں اور زور لگانے
سے بھی نہیں کُھلتے۔ دیر تک بند پڑے رہنے والے گھر اور بے محبت
آدمی کی مہک ایک جیسی ہوتی ہے۔

کہنے لگی: تمہاری باتوں میں اس قدر تنہائی کیوں ہے؟

میں نے کہا: دوپہر کی وجہ سے

کہنے لگی: زندگی بہت کچھ ہے

میں نے کہا: زندگی موت کی جیب سے چُرائی ہوئی دوپہر ہے

کہنے لگی: دوپہر کے وقت لوگ ملتے بھی تو ہیں؟

میں نے کہا: اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تم بھی ایک دوپہر ہو ایسی دوپہر جب تندور
میں روٹی لگاتے ہوئے جیراں ماچھن کا ہاتھ جل گیا تھا۔ جب
بخت بانو کی برات اُسے بن بیاہے لوٹ گئی تھی، جب کریم درزی
کی بیٹی گڑیا سیتے سیتے اسے ادھورا چھوڑ کر گلے میں پھندا ڈال کر

چھت سے لٹک گئی تھی ـــــ جب پولیس تشدد سے وہ حوالات میں مر گیا تھا۔

کہنے لگی: کیسی کڑوی کڑوی باتیں کر رہے ہو ؟

مَیں نے کہا: دوپہر ایک سچ ہے اس لئے اس میں کڑواہٹ تو ہو گی

کہنے لگی: کیا کوئی دوپہر جھوٹ بھی ہوتی ہے ۔

مَیں نے کہا: ہوتی ہے جب کوئی شہزادہ راستہ بھول جاتا ہے ۔ جب کوئی رانی ساری دوپہر سو کر گزار دیتی ہے ۔ جب پیار، نفرت کی رکھوالی کرتا ہے اُس کا پہرہ دیتا ہے ۔

کہنے لگی: تم نے صبح کے وقت کبھی دوپہر دیکھی ہے ؟

مَیں نے کہا: ایک بار ایک پہاڑی گاؤں میں ۔ وہ پن چکی پر آٹا پسوانے آئی تھی ۔ پھر ایک بار کچہری میں جب ایک شخص کو تاریخ بھگتنے کے لئے ہتھکڑیاں پہنا کر لایا گیا اُس کی بوڑھی ماں، بیوی اور ننھی بیٹی عدالت کے باہر ٹھہری ہوئی تھیں جب اُس کا نام پکارا گیا تو جیسے عدالت میں صبح کے وقت ہی دوپہر ہو گئی ۔

کہنے لگی: ایک بار جب پولیس دو نوجوان لڑکوں کو پکڑ کر لے گئی تھی تو مَیں نے اُن کی ماں کی آنکھوں میں اس طرح کی دوپہر دیکھی تھی ۔ دسمبر میں بھی لگتا تھا جیسے جون کا مہینہ ہو سردیوں کی وہ دوپہر کتنی لمبی تھی ۔

مَیں نے کہا: جب بھی ناانصافی کی لُو چلتی ہے تو دوپہر لمبی ہو جاتی ہے ۔ سنّاٹا گھنا ہو جاتا ہے آنکھیں اُمید کی صبح بھول جاتی ہیں

کہنے لگی، ہمارے ملک میں اتنی عدالتیں ہیں

مَیں نے کہا، عدالت کی بات تو بعد میں آتی ہے ۔ زندگی میں قدم قدم پر ایسی ایسی ناانصافیاں

ہوتی ہیں کہ جن کے خلاف کسی عدالت میں مقدمہ بھی درج نہیں کرایا
جاسکتا۔ سیاسی بھیڑ میں سفارش کا سکّہ چلتا ہے ——— بوسیدہ گھروں
کے دروازے نوجوانوں کے اپوائنٹ منٹ لیٹر کا انتظار کرتے کرتے
اب تھک گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں بیٹھی عورتیں غربت
کی لمبی دوپہروں میں مہینے کی باقی تاریخوں پر چھاؤں کاڑھتی ہیں، ٹیچر
نے بچے کو اورنج کی تصویر بنانے کا ہوم ورک دیا تھا مگر اس سے
ہر بار چوہے کی تصویر بن جاتی ہے۔ مرد ابھی گھر نہیں آیا۔ اُس نے اپنے
مُو و اوور کے سلسلہ میں جائنٹ سیکرٹری صاحب سے وقت مانگا تھا
پی۔ اے نے اُس کا گریڈ پوچھ کر اُسے صاحب کی مصروفیت سے آگاہ
کردیا ہے۔ مگر اُس کے دفتر میں کام کرنے والی ایک خاتون نے فون
کرکے جائنٹ سیکرٹری صاحب کو اپنے دفتر میں ہی بُلا لیا ہے۔

کہنے لگی: میں بھی ایک ایسی خاتون کو جانتی ہوں وہ ایک نالائق سی عورت ہے مگر عورت ہونے کی وجہ سے بہت سے فائدے اُٹھا لیتی ہے کوئی سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری یا اعلیٰ افسر ایسا نہیں جس سے اُس کی واقفیت نہ ہو۔ وہ ہر کام منٹوں میں کروالیتی ہے کسی پارٹی کی تصویر دیکھو وہ اُس میں موجود ہوتی ہے۔

میں نے کہا: یہ بھی ناانصافی کا ایک رُوپ ہے۔

کہنے لگی: میں نے ایک بیمار دوپہر بھی دیکھی تھی۔

میں نے کہا: میں نے ایک دوپہر کو ہسپتال کے برآمدے میں بے سُدھ پڑے دیکھا تھا اُس کے ہاتھ میں دوا کی شیشی تھی اُس کے منہ سے رالیں بہہ رہی تھیں چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ چوہے اُس کا دوپٹہ

کُتر کُتر کر کھا گئے تھے۔

کہنے لگی: ایک تو ہمارے ملک میں چوہے بہت ہیں۔ کیا یہ سرکاری دفتروں، وزیروں کے دفتروں اور پرائم منسٹر ہاؤس میں بھی ہیں۔

میں نے کہا: چوہے کو ان جگہوں میں داخل ہونے کے لئے کونسا سیکورٹی پاس لینا پڑتا ہے میرا خیال ہے چوہوں کی باتیں نہ کریں مجھے گھِن آتی ہے۔

کہنے لگی: آؤ دوپہر کی بات کرتے ہیں تم نے اپنی کتاب کا نام "خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر" رکھا ہے۔ تمہاری بات اب میری سمجھ میں آگئی ہے۔ یہ بتاؤ کیا تم نے کبھی ڈاک خانے میں بھی دوپہر دیکھی ہے۔

مَیں نے کہا: دیکھی ہے۔ وہ دوپہر ٹھہر جیسی تھی جو کھٹا کھٹ خطوں پر لگ رہی تھی میں نے ایک ایسی دوپہر بھی دیکھی ہے جو ڈاک کے ٹکٹ کی طرح تھی جس کا کونہ ہلکی سی چھاؤں کے ٹکڑے کی طرح پھٹا ہوا تھا ــــ وہ ہر روز صبح صبح اپنے بیٹے کا خط پوچھنے آتی تھی۔ پوسٹ ماسٹر اس سے کہا کرتا تھا ــــ اماں جاؤ ــــ دوپہر کو آنا۔ ڈاک دوپہر کو آتی ہے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلتی نہیں تھی اور کہتی تھی ــــ دوپہر تو ہوگئی ــــ حالانکہ اُس وقت صبح ہوتی تھی۔ ہر شخص کی اپنی اپنی دوپہر ہوتی ہے۔ سپین کے نامور شاعر اور ڈرامہ نگار لورکا کے ایک ڈرامے کا مشہور جملہ ہے ــــ دوپہر پانچ بجے۔

کہنے لگی: (پہلے اُس کی آنکھ سے کاغذ پر آنسو گرنے کی آواز آئی) تمہاری اس کتاب میں شامل کہانیوں میں دوپہر کہاں کہاں ہے؟

مَیں نے کہا: میری کہانیاں پڑھو تمھیں خود بخود پتہ چل جائے گا۔

کہنے لگی: (غصہ سے) میرا تو خیال ہے کہ تم بھی ایک دوپہر ہو ــــــ تنہا، اداس اور ویران دوپہر ــــــ جی چاہتا ہے تمھیں خط میں ڈال کر کسی کو پوسٹ کر دوں۔

پروں پر پانی

رات بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح نیند کی کھڑکی پر بیٹھی تھی۔ خاموشی گھر کے فرش پر ننگے پیر پھرتی تھی۔ ایک عجیب طرح کی خوشبو تھی جو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ چپ اور سوتے ہوئے گھروں کی بھی اپنی ایک مہک ہوتی ہے۔ ہر گھر سے الگ۔ اس مہک میں اس گھر کے لوگوں کی اداسیوں اور خوشیوں کی باس رچی ہوتی ہے۔

کنجوس دل گھروں اور کھلے دلوں والے گھروں کی مہک۔ کبھی یہ مہک جلتی ہوئی روئی جیسی اور کبھی ایسے کپڑوں جیسی ہوتی ہے جو دھوپ کی بجائے سائے میں سکھائے جاتے ہیں۔ مگر اس گھر سے اس وقت ایسی باس آرہی تھی جو کسی شخص کے لباس اور بوٹوں سے اس وقت اٹھتی ہے جب وہ بارش میں دیر تک چلنے کے بعد گھر پہنچتے ہی چولہے یا ہیٹر کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اتنے میں قدموں کی چاپ ابھری۔ بیٹا ماں کے کمرے کے سامنے سے گزر کر کچن کی طرف جا رہا ہے۔ ماں نے اپنے کمرے میں سے آواز دی۔

"تم ابھی جاگ رہے ہو؟"

"ہاں نیند نہیں آرہی" وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ ماں بیڈ کے ساتھ والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بیٹا قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں نے وقت سے

نظریں چرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔
"میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم رات بھر جاگتے رہتے ہو۔"

"نیند نہیں آتی ماں۔"
"کیا تم نے کسی لڑکی پر اعتبار کر لیا ہے؟" وہ مسکرائی۔
"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔"
"میں بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ تم نے اس پر اعتبار کر لیا ہے۔ اسی کو محبت کہتے ہیں۔
کون ہے وہ، کیسی ہے؟"
بیٹا تھوڑا سا شرمایا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر بولا۔
"ماں وہ بالکل تمہارے جیسی ہے۔ براؤن بال، نیلی نیلی آنکھیں۔ جب وہ چلتی ہے تو
اس کے بال اس طرح اُڑتے ہیں کہ لگتا ہے کوئی چڑیا فضا میں اڑ رہی ہے بالکل
روبن چڑیا کی طرح۔ ماں کیا تم نے کبھی روبن چڑیا دیکھی ہے؟"
وہ بیٹے کی بات سن کر چونکی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اس سے اپنی کیفیت چھپا لیتی۔
اس نے خوشی اور جوش بھری ہوئی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔
"کیا ہوا؟"
وہ اپنے آپ پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولی۔
"میں نے روبن چڑیا دیکھی ہے۔ وہی ہے نا یہ چڑیا جو بہت خوب صورت ہوتی
ہے اور اس کے سینے کے پر سرخ ہوتے ہیں۔ میں نے روبن کے بارے میں کئی
کہانیاں بھی سن رکھی ہیں۔"
بیٹے نے جھجک کر سر نیچا کر لیا اور سلیپر سے آدھا پاؤں باہر نکالتے ہوئے بولا۔
"کیا کہانی ہے روبن چڑیا کی؟"

پھر یوں لگا جیسے خاموشی کے ڈال سے کوئی چڑیا اڑی اور آ کر ان کے بیچ پڑا فاصلہ چگنے لگی۔ ماں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"ایک بار کسی نے مجھے بتایا تھا کہ روبن چڑیا نے اپنے سرخ پر کہاں سے لئے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن روبن چڑیا اڑ کر صلیب پہ جا بیٹھی۔ حضرت عیسیٰ کے کانٹے دار تاج میں سے وہ خار نکالنے کی کوشش کی، جو مسیحا کے ابرو میں چبھ رہا تھا۔ وہ یہ کانٹا نکال کر حضرت عیسیٰ کے درد کو کم کرنا چاہتی تھی۔ جب روبن چڑیا یہ نیک کام کر رہی تھی تو حضرت عیسیٰ کے خون کا ایک قطرہ روبن کے پروں پر گرا اور اس کے سینے کے پر ہمیشہ کے لئے سرخ اور چمکدار ہو گئے"۔

بیٹے کی آنکھوں میں بھی چمک ابھری اور لگا جیسے روبن چڑیا آ کر اس کی آنکھوں میں بیٹھ گئی ہے۔ وہ بولا۔

"ماں وہ لڑکی بھی بالکل روبن کی طرح ہے درد بانٹنے والی، دکھ کا بوجھ اٹھانے والی کھلے دل کی لڑکی۔ محبت سے لبالب بھری ہوئی"۔

"کنویں بہت گہرے ہوتے ہیں بیٹا۔ جلدی جلدی ان کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے اور اکثر غلط ہو جاتا ہے، پتہ ہے ایک بار بچپن میں تم ڈوبتے ڈوبتے بچے تھے"۔

اس نے حیرت بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ایک بار جب ہم پکنک پر گئے تھے، تو تم ندی کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکے تھے اور پانی میں اترتے ہی ڈبکیاں کھانے لگے تھے۔ تمہیں ایک کسان نے بچایا تھا۔"

وہ قدرے اداس ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اسے لگا جیسے اس کی ماں ایسی خشک ندی ہے جس کے کنارے وہ کب سے ہاتھوں کی اوک بنائے بیٹھا ہے مگر چلو بھر پانی بھی نہیں پی سکتا۔ پھر یکدم بولا۔

"ماں میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں، وہ شیشے کی طرح ہے۔ میں اس کے اندر جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔ وہ سچ بولتی ہے۔"

"تم نے اعتبار کر لیا ہے نا۔ عورت کا اعتبار آگ کی طرح ہوتا ہے۔ جل جاؤ گے جھلس جاؤ گے۔ یاد ہے ایک بار تم نے موم بتی سے اپنا ہاتھ جلا لیا تھا۔"

بیٹے نے اپنی جلی ہوئی انگلی پر چھوٹے سے نشان کو دیکھا اور اسے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے سہلاتے ہوئے بولا۔

"ماں وہ ایسی نہیں۔ وہ بہت سیدھی سادی لڑکی ہے اور مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔"

"بڑی تلخ چیز ہے محبت، نرا زہر۔ یاد ہے بچپن میں تم ہر چیز منہ میں ڈال لیا کرتے تھے اور ایک بار تم نے نیم کے درخت سے پھل توڑ کر کھا لیا تھا۔ تمہاری زبان کڑوی زہر ہو گئی تھی۔ تم دیر تک روتے رہے تھے۔ رو رو کر تمہاری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ میں نے تمہیں بہت سی میٹھی چیزیں کھانے کو دی تھیں۔ مگر کڑواہٹ تمہاری زبان سے اترتی ہی نہیں تھی۔ تم عورت کو نہیں سمجھتے، یہ ایک طلسماتی محل ہے اس میں داخل ہو جاؤ، تو یکدم سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور باہر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ انسان ٹکریں مار مار کر مر جاتا ہے۔"

"ماں تم بھی تو ایک عورت ہو۔"

"ہاں! مگر میں تمہاری ماں ہوں، تم انتہائی جذباتی بچے اور حساس ہو۔ اب دیکھو نا تم اس وقت جاگ رہے ہو۔ اس کی باتیں کر رہے ہو مگر وہ اس وقت بڑے مزے سے سو رہی ہو گی۔"

"نہیں ماں، وہ میرا درد سمجھتی ہے۔ کہا ہے نا وہ رو بن چڑیا کی طرح ہے۔ جس نے مسیحا کے ابرو میں چبھا ہوا کانٹا نکالنے کی کوشش کی تھی۔"

"تم نے خواہ مخواہ اپنے ابرد میں کانٹا چبھو لیا ہے۔ دراصل تم اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ ایسی پاگل پن جیسی محبت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں اور اپنے لئے کسی کی آنکھ میں تھوڑا سا وقتی احساس دیکھ کر اُسے پیار سمجھ بیٹھتے ہیں، مر مٹتے ہیں۔ اپنے آپ سے محبت کرنا چھوڑ دو۔ لڑکیاں روبن چڑیا بن جاتی ہیں، ہوتی نہیں۔ روبن چڑیا کی تو اور بھی بہت سی اچھی اچھی باتیں ہیں۔ تم نے روبن چڑیا دیکھی تو ہوگی، مگر اس کے بارے میں جانتے کچھ نہیں۔ تمہیں پتہ ہے کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ روبن ہر روز اپنی چونچ میں پانی کا قطرہ لے کر جہنم کی آگ کے شعلوں کو بجھانے کے لئے جایا کرتی تھی۔ اس طرح ایک دن ان شعلوں کی اذیت اور عذاب کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے پر جل گئے۔ اس کے سُرخ پر دل کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک جزیرے پر جب آگ نہیں تھی، تو چڑیا جزیرے کے لوگوں کے لئے آگ لے آئی اور اس کے پر بُری طرح جھلس گئے۔"

بیٹے نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ پر قابو پانے کے لئے اندر ہی اندر بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی مٹھیوں میں پسینہ آ گیا۔ وہ مٹھیاں کھولتے ہوئے بولا۔

"ماں وہ بھی اذیت کم کرتی ہے۔ بھرپور زندگی کی آگ اور تپش اٹھائے پھرتی ہے۔ میرے لئے صرف، میرے لئے۔"

"تم نے اس پہ اعتبار کر لیا ہے نا، اسے اپنی سچائی کی آنکھ سے مت پرکھو، اسے مرکز مت بناؤ، ایک طرف رکھو، اچھے رہو گے۔ ورنہ اذیت کم کرتے کرتے اور اذیت لے لو گے۔ پھیل جاؤ، خوشی کا گھر کسی ایک جگہ نہیں ہوتا۔ مکمل خوشی کوئی ایک نہیں دے سکتا۔ تمہیں کوئی لڑکی پوری طرح نہیں سمجھ سکتی۔ تم اُلّو بن جاؤ گے۔ یہ محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی۔" وہ مسکرائی۔

درد کی شدت سے بیٹے کا چہرہ تپ رہا تھا۔ مگر پھر بھی اس کے اندر ماں کو قائل کرنے کی خواہش ابھی پوری طرح موجود تھی۔ اس نے تھوڑی سی مسکراہٹ ماں سے ادھار لی اور بولا۔

"ماں وہ ایسی نہیں ہے۔ جیسی تم کہہ رہی ہو۔ وہ ایک مختلف لڑکی ہے۔"

"لڑکیاں مختلف ہی ہوتی ہیں۔ اصل میں ہوتی نہیں، لگتی ہیں۔ میں نے ایک لڑکی دیکھی تھی اور اس کے محبوب کا بھی اس کے بارے میں یہی خیال تھا کہ وہ رو بن چڑیا جیسی ہے۔ وہ تمہاری طرح اس میں روبن کی خصوصیات ڈھونڈتا رہا، اذیت سہتا رہا۔ سچ کی سولی پہ لٹکتا رہا مگر کمینگی، بے وفائی اور تھڑدلی کی دلدل میں پھنس گیا۔ وہ کھلے دل والا، کھرا اور سچا آدمی تھی۔ مگر اس کی روبن ہر نئی شاخ پہ بیٹھ جاتی تھی۔ تمہیں پتہ ہے کہ ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ گرمیوں میں روبن کے سرخ پر جھڑ جاتے ہیں اور سردیوں میں پھر نکل آتے ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی روبن تھی۔ اپنے محبوب سے ایسے کھیلتی تھی جیسے بلی گیند سے کھیلتی ہے۔ اس کی باتیں پیار میں اور دل زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اس سے بدلہ لے رہی تھی۔ اسے طرح طرح سے سزائیں دیتی تھی۔ نئے سال کی پارٹی میں کسی نئی آنکھ میں گھونسلا بنالیتی تھی... لڑکیاں پیسے سے محبت کرتی ہیں۔ دکھ کی نہیں، سکھ کی ساتھی ہوتی ہیں۔ جس روبن کی کہانی میں تمہیں سنا رہی ہوں۔ وہ بھی مرد کی محبت کی بجائے پیسے کو تحفظ سمجھتی تھی۔ نمک منڈی کے کسی تاجر کی طرح، جو ویسے تو بڑا خوش اخلاق ہوتا ہے۔ مگر کسی کو چائے کی پیالی بھی نہیں پوچھتا۔ پیسے پیسے پہ اس کی جان نکلتی ہے۔ یتیم خانے کو اس لئے چندہ دیتا ہے کہ وہاں سے ایک رسید ملتی ہے لوگوں کو پتہ چلتا ہے۔ وہ سڑک کنارے بیٹھے فقیر کو اس لئے کچھ نہیں دیتا کہ فقیر کے پاس رسید بک نہیں ہوتی۔ وہ روبن بھی ایسی ہی تھی تنگ دل۔ اچھے وقت کی ساتھی، مصروف زندگی کی دلدادہ، پارٹیوں کی

شوقین، شہرت کی بھوکی، سب کچھ اٹھا کر گھر لے جاتی تھی۔ محفل میں کسی کو کوئی تحفہ دیتی تھی تو اکیلے میں اٹھا کر جیب میں ڈال کر پھر گھر لے جاتی تھی۔ تو پھر تم ہی بتاؤ وہ کیسی رو بن تھی۔ اس نے اذیت کم کرنے کی بجائے اسے اور زیادہ عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اور پھر جانتے ہو کیا ہوا؟" بیٹا جو اب تک اپنے ہونٹ چبا رہا تھا، ہونٹوں سے دانت پرے ہٹا کر بولا ۔" ماں کہیں سے مری ہوئی بلی کی بو آ رہی ہے؟"

"ہاں آ رہی ہے۔ میری اگلی بات سنو گے تو اور زیادہ آئے گی۔ تمہاری ناک پھٹنے لگے گی اس بو سے۔ پتہ ہے روبن چڑیا کے بارے میں سب سے اچھی بات کیا مشہور ہے؟"

بیٹا چپ رہا۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ وہ بولی۔

"ایک عقیدہ یہ ہے کہ روبن ایسی چڑیا ہے کہ وہ کہیں کوئی لاوارث اور بے گور و کفن لاش دیکھتی ہے تو اسے پتوں تنکوں اور پھولوں سے ڈھانپ دیتی ہے۔"

وہ بھی اسے ایسی ہی روبن سمجھتا تھا جو اس کے مرنے کے بعد بھی اسی کی رہے۔ اس کی قبر پہ پھول چڑھانے آیا کرے۔ مگر جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کئی دن مردہ خانہ میں پڑی رہی۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ اس کا کوئی وارث مل جائے تو وہ لاش اس کے سپرد کر دیں۔ مگر اس کی محبوبہ، اس کی روبن چپ تھی۔ کیونکہ یہ بات اس کے علاوہ کسی اور کو معلوم نہیں تھی کہ صرف وہی اس کی لاش کی وارث تھی۔

بیٹا پریشانی اور گھبراہٹ کے مارے اٹھ کھڑا ہوا اور گہری نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی ماں کی آنکھوں میں ایک بھس بھری روبن پڑی تھی۔ اور اس کی ماں کے آنسو روبن کے پروں سے پھسل پھسل کر نیچے گر رہے تھے۔ تب اسے احساس ہوا کہ اتنی دیر سے ماں اسے اپنی ہی کہانی سنا رہی تھی۔

کاغذ کے ایک شہر کا قصّہ

یہ کاغذ سے بنے ہوئے ایک شہر کی بات ہے۔

وہ آرٹ اور کرافٹ کی ٹیچر تھی اور کلاس روم میں بچوں کو پڑھاتے ہوئے اس نے نیلے اور سفید کاغذ جوڑ کر یہ شہر آباد کیا تھا۔

ایک بچے نے اٹھ کر سوال کیا "ٹیچر اس شہر میں میرا گھر کس جگہ ہوگا؟"

ٹیچر نے اپنے سنہری بال جھٹکے اور تھوڑا سا جھک کر کاغذ کے شہر میں مکانوں کی ایک قطار پر انگلی گھماتے ہوئے بولی "یہاں۔ ان گھروں میں، ویسے تم کہیں بھی رہ سکتے ہو۔ کیونکہ اس شہر میں سارے گھر خوب صورت اور آرام دہ ہوں گے۔ روشن اور ہوا دار۔"

بچے کا منہ لٹک گیا۔ ٹیچر نے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔ "ٹیچر اس شہر میں ہمارا اتنا بڑا بنگلہ ہے اور اس کاغذ کے بنے ہوئے نئے شہر میں آپ مجھے اتنا چھوٹا سا گھر دے رہی ہیں۔"

"نہیں، یہ گھر چھوٹا نہیں، بالکل ضرورت کے عین مطابق ہے۔"

بچے کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے شہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ٹیچر اس شہر میں ہماری جمعدارنی اور نوکروں کے گھر کہاں ہوں گے؟"

ٹیچر نے اپنی براؤن آنکھوں میں پیار بھر کر ننھے طالب علم کی طرف دیکھا اور بولی۔

"اس شہر میں خاکروبوں اور نوکروں کے گھر نہیں ہوں گے اور شہر کے ہر چوک پر یہ

بورڈ آویزاں کر دیا جائے گا کہ اس شہر کے سب لوگ ایک جیسے ہیں۔ یہاں کوئی خاکروب نہیں۔ اس لئے ہر کسی کو اپنی پھیلائی ہوئی گندگی خود ہی صاف کرنا ہوگی۔ اس لئے مہربانی فرما کر شہر کی صفائی کا خیال رکھیں۔"

پھر وہ جلدی سے کاغذ کے بورڈ لگانے لگی۔ بچے غور سے اس کے تیز تیز حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں شہر کے معروف چوراہوں پر بورڈ لگ چکے تھے۔

پھر ایک اور بچہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بولا: "ٹیچر اس شہر میں پولیس نہیں ہوگی۔ انہوں نے میرے باپ کو بہت مارا تھا۔"

"ٹھیک ہے میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس شہر میں پولیس نہیں ہوگی۔"

اتنے میں ایک اور بچہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور قدرے بلند آواز میں بولا۔ "ٹیچر اس شہر میں پولیس ہوگی۔ میرے ابا پولیس میں ہیں۔ میں ان کے بغیر اس نئے شہر میں نہیں رہ سکتا۔"

اس نے دونوں بچوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کیونکہ اس کا اپنا باپ پولیس میں تھا۔ مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں تھا۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ وہ اپنے پاپا کے بغیر کیسے رہے گی۔ مگر اب وہ اپنے پاپا کے بغیر رہ رہی تھی۔ اس کے باپ کی بات ہی اور تھی۔ وہ پولیس افسر تو تھے مگر ان کے بارے میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ انہیں فلسفہ یا تاریخ کا پروفیسر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر موجودہ حالات میں اسے اس طالب علم کی بات میں زیادہ اثر محسوس ہوا۔ جس کا یہ خیال تھا کہ نئے شہر میں پولیس نہیں ہونی چاہیئے۔

ابھی وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ایک اور بچہ اٹھ کر بولا۔ "ٹیچر یہ جو نیا شہر آپ نے بنایا ہے، اس میں ریلوے اسٹیشن نہیں ہے۔"

"اوہ! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن تو بہت ضروری ہے۔" اس نے جلدی سے کاغذ اٹھایا اور ریلوے اسٹیشن کی عمارت بنانے لگی۔ جب وہ عمارت مکمل کر چکی اور ٹرین بنا رہی تھی تو ایک بچہ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے بولا۔ "ٹیچر آپ کے بنائے ہوئے شہر میں کوئی ایئرپورٹ ہی نہیں۔"

"ہاں یہ بھی بہت ضروری ہے۔ کیا تمہاری ممی شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں؟"

"جی ٹیچر وہ دوسرے شہر میں ہوتی ہیں۔ میں یہاں اپنے ابو کے پاس رہتا ہوں۔ ابو روز کہتے ہیں کہ وہ شام کی فلائٹ سے آئیں گی۔ مگر پتہ نہیں وہ کب آئیں گی۔ کاغذ کے اس نئے شہر میں ایئرپورٹ ضرور بنائیں ورنہ میری امی کیسے آئیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی بناتی ہوں۔"

اتنے میں ایک اور بچہ ہاتھ کھڑا کر کے بولا۔ "ٹیچر میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"بولو۔" اس نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کاغذ کو تہہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹیچر اس شہر میں جو آپ نے بنایا ہے، جیلیں اور تھانے نہیں ہونے چاہئیں۔ میرے چچا آج کل جیل میں ہیں۔ وہ ہر بار کسی جلسے میں تقریر کر دیتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کہہ دیتے ہیں کہ انہیں پولیس پکڑ کر جیل میں بند کر دیتی ہے۔"

ٹیچر کی گہری براؤن آنکھوں میں اُداسی چھا گئی۔ اس نے بچے کی رونی صورت کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں نے خود بھی یہی فیصلہ کیا ہے کہ اس شہر میں تھانے اور کچہریاں نہیں ہوں گی۔" لیکن پھر اس نے دل ہی دل میں سوچا اگر تھانے اور کچہریاں نہیں ہوں گی تو انصاف کیسے ملے گا۔ مگر اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی دے دیا۔ جب ناانصافی نہیں ہوگی تو پھر انصاف کا مسئلہ کیسے اٹھے گا۔ اسے پھر یکدم خیال آ گیا کہ شہر کے چوروں، ڈاکوؤں، لیٹروں، قاتلوں اور دوسروں کا حق مارنے والوں کے لئے سزا کون تجویز کرے گا۔ وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

کلاس کے بچوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔ "ٹیچر آپ چپ کیوں ہو گئی ہیں؟"

وہ چونکی۔ "سنو بچو!" اس کے لہجے میں ڈانٹ تھی۔ "اس شہر میں چور، ڈاکو، لیٹرے نہیں ہوں گے۔ کوئی کسی کا حق نہیں مارے گا۔ اور ہاں غور سے سنو۔ کوئی جھوٹ نہیں بولے گا۔ سب بچے وعدہ کریں کہ اس نئے شہر میں جو ہم نے بنایا ہے، کوئی جھوٹ نہیں بولے گا۔"

ساری کلاس نے باآواز بلند جھوٹ نہ بولنے کا وعدہ کیا۔ جب سب بچے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو ایک ننھی منی براؤن آنکھوں والی خوب صورت سی بچی اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔

ٹیچر نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "رانی تم کیوں کھڑی ہو؟"

بچی بولی۔ "ٹیچر میری دادی نے مجھے ایک کہانی سنائی ہے۔ جس میں ایک شہزادہ ہوا کے گھوڑے پر بیٹھ کر آتا ہے۔ کیا اس میں کوئی ہوا کے گھوڑے پر بیٹھ کر آئے گا۔"

وہ مسکرائی۔ اس کے دل میں کئی خیال آئے مگر اسے کوئی جواب سجھائی نہ دیا۔ بس وہ اتنا کہہ سکی۔ "اس شہر میں خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہ ہو گی۔"

بچی بولی۔ "ٹیچر آپ نے اس شہر کے لئے تتلیاں تو بنائی ہی نہیں۔ کیا اس شہر میں تتلیاں نہیں ہوں گی؟"

"کیوں نہیں ہوں گی۔" اس نے کاغذ اٹھایا اور اسے کاٹ کر تتلیاں بنانے لگی۔ پھر اس نے بچوں کے کہنے پر اس شہر کے لئے خوب صورت پروں والے پرندے بنائے۔ جب وہ چڑیاں بنا رہی تھی تو ایک بچی اٹھ کر بولی۔ "ٹیچر اس شہر کے لئے آٹے سے چڑیاں بنانی چاہئیں۔" اسے یکدم اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب اس کی دادی آٹا گوندھ کر اسے آٹے کی چڑیا بنا کر دیا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے رنگ سے ایک چڑیا پر اس کا نام لکھ دیا تھا۔ تب اسے احساس ہوا تھا کہ آٹے سے بنی ہوئی وہ چڑیا اڑ نہیں سکتی۔ یکدم اس نے ننھی طالبہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ "آٹے سے بنی ہوئی چڑیوں کو اڑنے میں دشواری ہو گی۔"

بچی بولی: "ٹھیک ہے ٹیچر" اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

لیکن فوراً ہی ایک اور بچے نے اٹھ کر سوال کر دیا۔ "ٹیچر آپ نے اس شہر کے لئے

کوا نہیں بنایا۔"

"اوہ! وہ تو میں بھول ہی گئی۔"

"نہیں ٹیچر کوا مت بنانا۔" ایک اور بچہ اٹھ کر زوردار آواز میں بولا۔ "کوا بچوں کے ہاتھوں سے روٹی چھین لیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کوا نہیں ہوگا اس شہر میں۔"

ایک اور بچہ جو ابھی تک چپ بیٹھا تھا اور کاغذ کے اس نئے شہر میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہا تھا اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ٹیچر میں آپ کے بنائے ہوئے اس شہر میں رہوں گا۔ مگر اس شہر میں چوہے اور چھپکلیاں نہیں ہونی چاہئیں۔"

"ہوں بھی تو کیا ہے۔ کیا تم چوہوں اور چھپکلیوں سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں ٹیچر چوہے چائے کے برتن پلید کر دیتے ہیں، کھانے والی چیزوں میں منہ ڈال دیتے ہیں۔ الماریوں کے پیچھے ہڈیاں، روٹیوں کے ٹکڑے، ربڑ، بوتلوں کے ڈھکنے اور جانے کون کون سی گندی چیزیں جمع کر لیتے ہیں۔"

"ٹیچر کی براؤن آنکھوں میں پیار آگیا۔ اس نے جذباتی سے بچے کو تسلی دی اور بولی۔ مگر چھپکلیوں کا کیا ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ڈر کر بھاگ جائیں گی۔"

"ٹیچر آپ تو مجھے اکیلا چھوڑ کر اپنے گھر چلی جائیں گی۔"

"نہیں میں اس شہر میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔" اس نے ایک اور کاغذ اٹھایا، اور اسے تہہ کر کے کسی شکل میں ڈھالنے لگی۔ اتنے میں ایک اور بچہ اٹھا اور بولا۔ "ٹیچر کیا اس شہر میں بموں کے دھماکے بھی ہوں گے۔"

"نہیں گڈو.... اس شہر میں بموں کے دھماکے نہیں ہوں گے۔"

اتنے میں سکول کی گھنٹی بجی۔ بچوں نے جلدی جلدی اپنے بیگ سنبھالنے شروع کر دیے ڈیسک پر پڑی ہوئی کاپیاں اور کتابیں بیگ میں ٹھونسیں اور کلاس روم سے نکل گئے۔

اب کلاس روم میں ٹیبل پہ بنا ہوا شہر پڑا تھا اور اکیلی ٹیچر اس کے پاس کھڑی تھی۔ شہر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ کہ شہر میں جو چیزیں رہ گئی ہیں وہ انہیں گھر جا کر مکمل کرے گی۔ اس نے کاغذ کا وہ شہر بڑی احتیاط سے اٹھایا اور اسے اپنے گھر لے گئی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ کھل اٹھی۔ وہ اس کا منتظر تھا۔ وہ اس سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ اسے سرپرائز اچھا نہیں لگتا۔ مگر پھر بھی وہ اسے اطلاع دیئے بغیر آجایا کرتا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور ہاتھوں میں تھامے ہوئے شہر کی طرف چہرہ جھکاتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو ہم نے کلاس میں یہ نیا شہر بنایا ہے۔ کاغذ جوڑ کر۔“

وہ مسکرایا۔ ”کیا ہمیں بھی آپ کے اس شہر میں رہنے کے لئے جگہ مل جائے گی؟“

”کیوں نہیں، اگر میں اس شہر میں رہوں گی تو تمہیں بھی اس شہر میں رہنا پڑے گا۔“ وہ قالین پہ بیٹھ گئی اور کاغذ کے شہر کو بھی قالین پہ رکھ دیا۔

وہ بھی صوفے پہ سے اٹھ کر اس کے قریب آکر قالین پہ بیٹھ گیا۔ جب وہ دونوں اس شہر کے کنارے بیٹھے تھے تو وہ بولی۔ ”تم ہر بات میں ٹریجڈی تلاش کر لیتے ہو۔ اب ایک بات غور سے سن لو۔ اس نئے شہر میں کوئی ٹریجڈی نہیں ہوگی۔ محبت کرنے والے کبھی جُدا نہیں ہوں گے۔“

وہ چپ چاپ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نئے شہر کی شبیہہ دیکھتا رہا۔ وہ مسلسل بولتی جا رہی تھی۔ اس نے آج کلاس روم میں شہر کے بارے میں ہونے والی گفتگو بھی تفصیل سے اسے سنائی تو وہ بولا۔ ”واقعی مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ان سب بچوں کی باتیں میری باتیں ہیں۔“ پھر اس نے ہنس کر شہر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اس شہر میں ایک کمی رہ گئی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”اس شہر کے کنارے پھلوں کے درخت بھی ہونے چاہئیں۔ تمہیں چیری اور سٹرابری پسند ہے۔ لاؤ میں بنا دیتا ہوں۔“ وہ سٹرابری کے درخت بنانے لگا۔

"نہیں سیب اور انار کا جوس اچھا لگتا ہے۔ میں کچھ درخت انار اور سیب
کے بناتی ہوں۔"
تھوڑی دیر میں کاغذ کے شہر کے کنارے جیری، انار اور سیبوں کے درختوں کی قطاریں
لگ گئیں۔
اس نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔" تم کہو تو میں ایک سیب
توڑ کر کھا لوں۔"
"ایک تو تم کھاتے بہت ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔
وہ دونوں مل کر ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر وہ یکدم
سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔
"تمہیں پتہ ہے اس شہر میں ایک اداس لڑکی بھی رہتی ہے اور ہر وقت کھڑکی سے
لگی رہتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں انتظار ہے۔"
وہ بولا۔" تمہیں معلوم ہے اس شہر میں ایک اداس آدمی بھی ہے۔ اس کی آنکھیں انتظا
ر سے بھری ہوئی ہیں۔" پھر یکدم دونوں کی نظریں ملیں۔
پھر اس نے قریب پڑا ہوا کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس پر سرخ سیاہی سے
لکھا۔" اب وہ مل گئی ہے تو کھونا نہیں۔"
اس نے غور سے وہ جملہ پڑھا اور بولا۔" تم نے اپنے اس شہر میں قبرستان تو
بنایا ہی نہیں۔"
"پھر سے آئے ہو نا ٹریجڈی، میں نے شروع میں کہا تھا کہ میں روگ نہیں پال سکتی۔"
"موت بھی بڑی خوب صورت چیز ہے۔ اگر قبرستان نہیں ہو گا، تو پھر میری قبر کہاں
بنے گی۔ تم میری قبر پہ کیسے آیا کرو گی؟"
اس کی آنکھوں میں اجنبیت جھلکی۔" میں مرے ہوئے لوگوں پہ یقین نہیں رکھتی۔ جو مر

گیا اس کی قبر پہ پھول چڑھانے کا کیا فائدہ؟"

"کیا موت کے بعد رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ محبت ختم ہو جاتی ہے؟"

"موت کے بعد رشتے مٹی ہو جاتے ہیں تو اب تم خود ہی بتاؤ، مٹی کو کون پلو سے باندھ کر پھرتا ہے۔ مجھے پلو میں بندھی ہوئی قبریں اچھی نہیں لگتیں۔"

"تو کیا تمہارے اس شہر میں محبت نہیں ہوگی؟"

"محبت تو خوشی کا نام ہے۔ اس شہر میں دکھ نہیں ہوگا۔ بس خوشی ہی خوشی ہوگی"

"تو پھر اس شہر میں کوئی کسی کے دکھ کا ساتھی بھی ہوگا کہ نہیں۔"

"جب دکھ کا روگ پالنا ہی نہیں تو پھر دکھ کے ساتھی کی کیا ضرورت ہے؟"

اس نے ایک بار پھر شہر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میرا خیال ہے شہر میں تھوڑی سی دردمندی ضرور ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شہر قہقہوں میں ڈوب جائے تو اس کی زندگی تھوڑی رہ جاتی ہے۔"

"ہم خوشی تلاش کرنے نکلے ہیں۔ ایسے تو ہم ایک دوسرے سے بہت دور چلے جائیں گے۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"لیکن تم نے تو کہا تھا محبت۔"

"ہاں کہا تھا۔"

"تو کیا محبت کبھی ختم ہو سکتی ہے، تبدیل ہو سکتی ہے۔"

"ہاں ہو سکتی ہے۔ محبت تو ہر نئے شہر سے ہو جاتی ہے۔ تم نے وہ لوگ نہیں دیکھے جو عرصہ دراز تک کسی ایک شہر میں رہتے ہیں اور پھر جب کسی نئے شہر میں آباد ہو جاتے ہیں تو اس شہر سے بھی اتنا ہی پیار ہو جاتا ہے۔"

"لیکن اپنے آبائی شہر سے محبت ختم تو نہیں ہو جاتی۔"

"ہو جاتی ہے۔" اس نے مکمل یقین سے کہا۔

"تو پھر ان کو اپنے اس شہر سے محبت ہوتی ہی نہیں ہوگی۔ ورنہ میرے خیال میں محبت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔"

"میں یہ بات نہیں مانتی۔"

اسے یوں لگا جیسے وہ اس کے بنائے ہوئے کاغذ کے شہر میں آباد ہو گیا ہے۔ مگر وہ خود اس شہر کو چھوڑ کر جا رہی ہے تو اس نے پوچھا۔ "کیا تم کوئی نیا شہر آباد کرو گی؟"

"کیوں نہیں، ضرور۔" اس کے لہجے سے جدائی کی مہک آ رہی تھی۔

وہ بولا۔ "دیکھو! شہر آباد کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے اور پھر نجانے نیا شہر اپنی مرضی کا ہو بھی یا نہیں۔"

"یہ تم سے کس نے کہا۔ سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"کیا تمہیں اس شہر سے محبت نہیں جو تم نے خود ہی بنایا ہے۔"

"وہ تو نئے شہر سے بھی ہو جائے گی۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں اس شہر سے محبت ہے۔ تو کیا محبت ختم ہو سکتی ہے۔ تم نے تو کہا تھا اس شہر میں کوئی جھوٹ نہیں بولے گا۔"

"تم کتنے پاگل ہو۔"

"مگر میں تو اب بھی تمہارے بنائے ہوئے اس شہر سے" اس شہر کی باتوں سے محبت کرتا ہوں۔ خدا کے لئے یہ شہر چھوڑ کر نہ جاؤ۔ دیکھو کتنی تیز بارش شروع ہو گئی ہے۔ اپنے اس شہر کو بچا لو۔ یہ ہماری سچائی کا سمبل ہے۔"

مگر وہ اس کی باتیں سنی اَن سنی کر کے وہاں سے چلی گئی۔ جیسے اس سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا..... اس بات کو کئی سال ہو گئے ہیں۔ پتہ نہیں وہ لڑکی کہاں ہے۔ مگر وہ اب بھی اس کے بنائے ہوئے کاغذ کے اسی شہر میں رہتا ہے۔

جاگتے سمندر کے کنارے، سوئی ہوئی کشتیاں

مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی ہے مگر جب اس کہانی پر میری نظر پڑی تو اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے اور میں ایک کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ جہاں بہت سے جوتے پڑے ہوئے تھے۔ تو بس یوں سمجھئے کہ اس کہانی کی ابتدا ایک کمرے کے باہر پڑے ہوئے ان جوتوں سے ہی ہوتی ہے جنہیں پیروں سے اتار کر بہت سی عورتیں اور لڑکیاں کمرے کے اندر چلی گئی تھیں، اور اب قالین پر ڈھولک کے گرد بیٹھی شادی کے گیت گا رہی تھیں۔

میں دیر تک ان جوتوں کو دیکھتا رہا کیونکہ خوب صورت جوتے میری کمزوری ہیں۔ اچھے، خوب صورت اور سنجیدہ قسم کے جوتے پہننے والے لوگ مجھے دل سے اچھے لگتے ہیں۔ صاف ستھرے پیر اور ان کے مطابق جوتے انسان کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتے ہیں۔ اس لئے جب بھی کہیں کوئی فرشی نشست ہوتی ہے اور لوگ جوتے اتار کر اندر چلے جاتے ہیں تو میں ان جوتوں سے بندھا کہانیوں کا سفر کھوجتا رہتا ہوں۔ جوتا پہننے والے کی شخصیت کو پڑھتا رہتا ہوں۔ اوچھے اور بھڑکیلے جوتے، بے سفر جوتے، سفر کی مار کھائے ہوئے جوتے، کار والوں کے جوتے، پیدل چلنے والوں کے جوتے، بے منزل جوتے، پختہ ارادوں والے جوتے، نا امید جوتے، ایک طرف کو جھکے

ہوئے اور بکھرے ہوئے جوتے۔ صاف پیروں کے جوتے، گندے پیروں کے جوتے۔ محبت کرنے والوں کے جوتے، خوب صورت پیروں کے جوتے، بھدے پیروں کے جوتے۔

یہ کہانی بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے جب کمرے کے باہر بہت سے جوتے سردیوں کے موسم میں رات کے وقت جوڑوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ جو عام زندگی میں ایک دوسرے کے قریب بھی نہیں بیٹھے تھے۔ اس وقت ان کے جوتے ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے، اتنے میں دو بوڑھی عورتیں اندر سے آئیں۔ دونوں نے غور سے سارے جوتوں میں سے اپنے اپنے جوتے پہچانے اور انہیں پہن کر چل پڑیں، تو بس کہانی بھی چل پڑی۔ پھر وہ بوڑھی عورتیں جن کی عمریں ستر اسی سال کے لگ بھگ ہوں گی ایک دوسرے کمرے کی طرف بڑھیں جیسے کوئی سنجیدہ بات کرنے جا رہی ہوں۔ انہوں نے اپنے جوتے پھر کمرے کے باہر اتار دیئے اور اندر چلی گئیں۔ انہیں شادی بیاہ کے گیتوں کا مزہ نہیں آ رہا تھا اور جو غزل اب وہ سن رہی تھیں اس میں بے پناہ تنہائی تھی، دکھ تھا اور درد فراق کی بات تھی۔

پہلے میں ان بوڑھی عورتوں کی پہچان کرا دوں۔ ان میں سے ایک بہت خوب صورت تھی اور اس عمر میں بھی اس کی آنکھیں انتہائی چمکدار، گہری اور براؤن رنگ کی تھیں، اور لگتا تھا کہ کبھی اس کے بال بھی اتنے ہی چمکیلے اور خوب صورت رہے ہوں گے۔ دوسری بوڑھی عورت اس جتنی خوب صورت نہیں تھی مگر اس کے بال ابھی کہیں کہیں سے سیاہ تھے۔ اس کی آنکھیں عام اور سادہ سی تھیں، جن میں دور تک انتظار پھیلا ہوا تھا۔

چمکدار، گہری اور براؤن آنکھوں والی بوڑھی عورت نے پہلے اپنے بالوں کو کھولا اور انہیں پھر سے باندھتے ہوئے بولی۔ میں جب بھی یہ غزل سنتی ہوں تو میری یادوں کو آگ لگ جاتی ہے۔ بالکل جیسے گرمیوں کے دنوں میں پہاڑوں پہ درختوں کو آگ لگ جاتی ہے

تو کئی کئی دن نہیں بجھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔ میں آگ بجھا بجھا کر تھک گئی ہوں۔ مگر جتنا بجھاتی ہوں وہ اور بھڑکتی ہے۔

عام اور سادہ سی آنکھوں والی بوڑھی عورت نے اپنی آنکھوں میں پھیلے ہوئے انتظار کی اوٹ سے براؤن آنکھوں والی بوڑھی عورت کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی تمہاری جھیل جیسی آنکھوں میں اب بھی اس کا عکس ڈولتا ہے۔ تمہارے دل کے آنگن میں اس کی یاد کی چھاؤں ہے۔ مگر میرے من میں انتظار کی چلچلاتی دھوپ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میری زندگی بالکل خالی ہے۔ جس کے دروازے پر کوئی دستک کوئی آہٹ نہیں۔

براؤن آنکھوں والی بوڑھی عورت نے پوچھا، "کیا تم نے شادی نہیں کی؟"

کی تھی، مگر محبت نہیں کی۔ شوہر اور محبوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

براؤن آنکھوں والی بوڑھی عورت افسردہ لہجے میں بولی۔ مجھ سے اس نے محبت کی تھی مگر میں ڈر گئی تھی۔ وہ اس وقت آیا تھا جب میری آدھی سے زیادہ عمر گزر چکی تھی۔ اس وقت میں پینتالیس سال کی تھی۔ خوش باش۔۔۔۔ گھر۔۔۔ شوہر۔۔۔ بچے۔۔۔۔ اس کی عمر اس وقت چالیس سے کم تھی۔ میں نے اپنے اوپر جو بزرگی طاری کر رکھی تھی، اس کے آنے ہی دھڑام سے نیچے آ گری۔ بالکل جیسے کوئی پیچھے سے آکر یکدم آنکھوں پر ہاتھ رکھ دے اور کہے بوجھو میں کون ہوں۔ پھر جب اس نے میری آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے اور میری طرف دیکھا تو مجھے لگا جیسے میں نے پہلی بار کسی مرد کو دیکھا ہے۔ اس کے چہرے پر مجھے ڈھونڈ لینے کی خوشی کا موسم دور تک پھیلا ہوا تھا۔

عام اور سادہ سی آنکھوں والی بوڑھی عورت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
جب کوئی کسی کو ڈھونڈ لیتا ہے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔

ہاں بہت اچھا لگتا ہے مگر اس وقت میری آدھی سے زیادہ زندگی گزر چکی تھی۔
میں ڈر گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اچانک میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا۔

لوگ کیا کہیں گے ۔ یہ کوئی عمر ہے محبت کرنے کی ۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی ۔
مجھے اپنی کیفیت اس لڑکی کی طرح محسوس ہوئی جس کا دوپٹہ ہوا کے تیز جھونکے سے اڑ
جاتا ہے تو وہ اس کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگتی ہے اس نے ہوا کے
جھونکے کی طرح مجھے اڑا دیا تھا اور میں اپنے ہی پیچھے بھاگ رہی تھی ۔ اپنا تعاقب کر رہی
تھی ۔ اپنے آپ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ اتنے میں تیز آندھی آگئی اور موسلادھار
بارش شروع ہوگئی ۔ مگر میں بھاگ رہی تھی ' بھاگ رہی تھی ۔

تم نے اچھا نہیں کیا ۔ اتنا خوب صورت وقت لوگوں کے خوف سے گم کر دیا ۔ میں
ہوتی تو اسے اپنے دل میں اس طرح چھپالیتی جیسے کوئی ننھی منی بچی مٹھی میں ٹافی چھپالیتی
ہے ۔ سادہ اور عام سی آنکھوں والی بوڑھی عورت نے کہا اور پھر قدرے توقف کے
بعد بولی ۔

'کیا تمہاری شادی والدین کی مرضی سے ہوئی تھی ؟'

شادی کیسی بھی ہو ' شادی ہوتی ہے ۔ شادی ایک انوکھا بندھن ہے ۔ زندگی کی
چادر پہ اپنے ہاتھوں سے کاڑھا ہوا ٹیڑھا پھول ۔ جس کے رنگ کبھی ذرا دیر سے اور
کبھی بہت جلد پھیکے پڑ جاتے ہیں ۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس پھول کے رنگ آزمائش کی دو
دھلائیاں بھی نہیں سہتے اور کھر جاتے ہیں ۔ بالکل ایسے جیسے ایک مرتبہ جب میں بہت
چھوٹی تھی تو میرے والد نے میرے اصرار پہ مجھے چھوٹی سی رنگین چھتری خرید کر دی تھی ۔
مگر جونہی بارش شروع ہوئی اور میں نے چھتری تانی تو اس کے سارے رنگ کھر کر میرے
چہرے ' بدن اور لباس پہ پھیل گئے تو میں رو پڑی ۔ بس شادی بھی ایسی ہی ہے ۔ شوق
سے خریدی ہوئی رنگین چھتری جس کے رنگ بہت جلد کھر کر سارے بدن اور لباس کو اپنی
مرضی کے بھدے ' چُبھنے والے بے ترتیب رنگوں میں لپیٹ لیتے ہیں ۔

عام اور سادہ آنکھوں والی بوڑھی عورت بولی ۔

ایسی ہی ایک چھتری میری والدہ نے مجھے خرید کر دی تھی۔ اس کے رنگ تو جلدی نہیں اترے اور اس نے مجھے دھوپ سے بھی بچائے رکھا.... مگر محبت، اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔

"مجھے محبت تو ملی۔" براؤن آنکھوں والی بوڑھی عورت پھر بولی۔" مگر آدھی زندگی کے بعد۔ جب وہ شخص مجھ سے ملا جو عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا تو مجھے محبت کا احساس ہوا۔ وہ ساری رات میرے دل کی سنسان گلیوں میں صدا لگاتا رہتا تھا۔ جاگتے رہو، جاگتے رہو۔ اور میں یہ سوچ کر کہ لوگ کیا کہیں گے، سوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی میرے سپنے میری نیند میں سے مجھے ڈھونڈ لیتے تھے تو میں ڈر کر لحاف سر تک کھینچ لیا کرتی تھی۔"

نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نہیں محبت کی سچائی کو سنبھال لینا چاہیے تھا۔

میں ڈر رہی تھی اور پیچھے ہٹ رہی تھی وہ آگے بڑھ رہا تھا..... میری کیفیت اس لڑکی کی طرح تھی جو تیز آندھی میں کھڑکی بند کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر ہوا اس قدر زور آور ہوتی ہے کہ لڑکی کو بے بس کر دیتی ہے اور کھڑکی اس سے بند نہیں ہو پاتی۔ ایسے میں، میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل میرا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری آنکھوں سے شروع ہوتا تھا اور میری آنکھوں پر ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مگر پھر لوگوں کا خوف، اپنی عمر کا خیال۔ میں نے اُسے اپنے ہاتھ دکھائے اور کہا۔ دیکھو میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ وہ مسکرایا اور بولا۔ تمہاری آنکھوں پر میری محبت سنہری لفظوں سے لکھی ہوئی ہے۔ اسی لئے تمہاری آنکھوں کا رنگ سونے جیسا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واقعی میری آنکھوں میں تھا اور لمحہ لمحہ میرے دل سے میری عمر مٹا رہا تھا۔ پھر یکدم مجھے احساس ہوا جیسے میں سترہ اٹھارہ سال کی وہ لڑکی ہوں جو پہلی بار پورا لباس پہنتی ہے تو اسے اپنے مکمل ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس دن پینتالیس سال کے بعد میں پہلی بار جوان ہوئی تھی۔ وہ میری طرف یوں دیکھ

رہا تھا۔ جیسے میں نے اس کا کچھ دینا ہو۔ اس کے انتظار کا ادھار چکانا ہو۔

تم کتنی خوش قسمت ہو دوسری بوڑھی عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے زندگی کے کسی حصے میں بھی محبت نہیں دیکھی۔ میں ساری زندگی قدموں کے نشان ہی ڈھونڈتی رہی۔ اس لڑکی کی طرح جس کے ہاتھ سے کڑھائی کرتے کرتے سوئی گر جاتی ہے۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہے۔ سوئی سامنے پڑی ہوتی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ عام طور پہ ایسے وقت کوئی دوسرا سوئی ڈھونڈ دیتا ہے مگر میرے ساتھ تو ایسا بھی نہیں ہوا، اور جب عمر کی دھوپ کا سایہ زندگی کی منڈیر سے ڈھل گیا تو میرے اندر بہت سی انتظار بھری شامیں یوں ٹھہر گئیں جیسے بچے کی آنکھ میں آنسو ٹھہر جاتا ہے۔ اب پلٹ کر دیکھتی ہوں تو اپنی زندگی آنسو کی اس لکیر کی طرح لگتی ہے جو کسی بچے کے گال پہ آنکھ سے لڑھک کر تھوڑی دور جا کر خشک ہو جاتا ہے۔

براؤن آنکھوں والی بوڑھی عورت کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر ایک لمبی سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔

ایسی ہی ایک لکیر کا سایہ میری عمر کی ڈھلتی ہوئی دوپہر پہ بھی ہے۔ جب وہ اچانک کہیں سے آ گیا تھا جو مجھے اتنا صحیح بیان کرتا تھا کہ میں کیا بتاؤں؟ میں بوکھلا گئی۔ میں اداس نہیں تھی۔ اس نے مجھے اداس کر دیا۔ میں تنہا نہیں تھی، اس نے مجھے تنہا کر دیا۔ میں جوان نہیں تھی، اس نے مجھے جوان کر دیا۔ میں جاگنے کی عادی نہیں تھی مگر اس نے مجھے بے نیند کر دیا۔ میں ڈرتی تھی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی رہی۔ وہ آگے بڑھتا رہا، آگے اور آگے۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹتی رہی۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ پیچھے دیوار آ گئی۔ میرے شوہر، بچوں اور عمر کی دیوار۔ میری کمر دیوار سے ٹکرا گئی تو میں بے بس ہو کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ گیا اور اس نے میرے سامنے میری زندگی کی کتاب سے میری عمر کا ایک ایک سال پھاڑ کر بے دردی سے پھینک دیا۔ صرف

شروع کے سترہ اٹھارہ صفحے رہنے دیئے۔ میرے سامنے میری عمر کے ورق ہوا میں بکھر گئے۔
میں بکھر گئی۔ دور تک میں ہی میں تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی۔ باقی سالوں کی عورت اس نے
میرے ذہن، جسم اور روح سے یوں مٹا دی جیسے سمندر کی کوئی لہر ریت پہ بنے نقش اپنے
ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ کیسا شخص تھا وہ جس نے میری عمر گھٹا دی تھی۔ مگر میں پھر ڈر گئی
کہ لوگ کیا کہیں گے۔ وہ اس وقت آیا جب میری کیفیت اس بچے کی طرح تھی کہ جس کی ماں
گھر پہ نہیں ہوتی اور اچانک گلی میں خوب صورت رنگین غبارے بیچنے والا آجاتا ہے۔

سادہ اور عام سی آنکھوں والی بوڑھی عورت نے اداس لہجے میں کہا۔ یہ تم نے کیا
کیا ایسے لوگ زندگی میں بار بار نہیں آیا کرتے۔"

ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر میں ڈر گئی تھی۔ میں بھاگتی رہی۔ اب میں بھی یہی سوچتی ہوں
کہ میں لوگوں کے خوف کے مارے اس سے کیوں دور بھاگتی رہی۔ اس سے جس نے میری
آنکھوں کے بند دروازوں کو مدت کے بعد پہلی بار کھولا تھا۔ اس وقت جب وہ کھلنا بھول
چکے تھے اور کھولنے کی کوشش کرو تو چیختے تھے۔ شور مچاتے تھے۔ میں نے ۵۴ سال کی
عمر میں پہلا خوب صورت خواب دیکھا تھا۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ زندگی کو پھر سے
کیسے شروع کروں۔ میں اس عورت کی طرح تذبذب میں پڑ گئی جو آدھے سے زیادہ سویٹر بن
چکتی ہے تو اسے معاً احساس ہوتا ہے کہ اس نے سویٹر پہ جو نمونہ بُنا ہے، وہ خوب صورت
نہیں لگ رہا یا ویسا نہیں جیسا وہ چاہتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آدھی سے
زیادہ زندگی کو پھر سے کیسے بُنوں یا اس پہ بنے ہوئے ڈیزائن سے آگے یکدم نیا ڈیزائن
کیسے بن دوں۔ اور پھر لوگ اسے دیکھ کر کیا کہیں گے۔

میں عمر کے اس حصے میں تھی کہ جب بارش ہونے لگے تو صرف ایک ہی خیال آتا ہے
کہ اس بارش کا فصلوں پہ کیا اثر پڑے گا۔ مگر اس نے مجھے یوں بدل کر رکھ دیا کہ میں بارش
کے وقت بے چین ہونے لگتی۔ میرے اندر تنہائی کا احساس جاگ اٹھتا اور میں اسے ملنے

کے لئے بے قرار ہو جاتی۔ پھر وہ بہت زیادہ اداس ہو گئی اور کچھ دیر چپ رہنے کے بعد سامنے بیٹھی ہوئی سادہ اور ویران آنکھوں والی بوڑھی عورت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ اب خود مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے بہت کچھ کھو دیا۔ لوگوں کے خوف سے، باتوں کے ڈر سے۔ وہ مجھے سمندر کی طرح بلاتا رہا مگر میں ڈری اور سہمی ہوئی سی کشتی کی طرح کنارے سے لگتی جا رہی تھی۔ میں اس سے وعدہ کر کے اس سے ملنے بھی نہیں گئی۔ وہ مجھے ڈھونڈتا رہا۔ میں نے اس کے کہنے پر اپنا سیاہ سوٹ اور بالیاں بھی نہیں پہنیں۔ وہ مجھے آوازیں دیتا رہا مگر میں لوگوں کی باتوں کے خوف سے اٹھارہ سال کا موڑ مڑ کر پھر پینتالیس سال کی سڑک پر آ گئی۔ جہاں وہ بہت دور رہ گیا۔

"کیا تم نے اس سے بالکل محبت نہیں کی؟"

"ہاں کی تھی، مگر اتنی دیر جتنی دیر میں کوئی لڑکی اپنے بال کھول کر انہیں پھر سے باندھ لیتی ہے۔ لیکن اب میری روح پر، میرے بڑھاپے پر اس کی یاد دل کے نقش باقی ہیں۔ مگر میں اب بھی اسے اس خیال سے یاد نہیں کرتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اس بوڑھی عورت کو کیا ہو گیا ہے۔

اس سے زیادہ مجھ سے سُنا نہیں گیا۔ کہانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا دل درد سے بھر گیا۔

میں نے الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے آخری بار کمرے کے باہر پڑے ہوئے ان دونوں بوڑھی عورتوں کے جوتوں کی طرف دیکھا۔ جو ان پرانی کشتیوں کی طرح لگ رہے تھے جو کھلے سمندر میں تیرنے کے قابل نہیں رہتیں تو انہیں سمندر کے کنارے ریت پر اتار کر بے دلی سے پھینک دیا جاتا ہے اور وہ ریت کے گھروندوں کی طرح ہو جاتی ہیں اور تیز ہوا کے جھونکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہتی ہیں۔

کسی اور گاؤں کا آدمی

جب بھی محبت پر سے میرا یقین اٹھنے لگتا ہے مجھے اس شخص کا صندوق یاد آجاتا ہے۔

بھری گرمیوں کے دنوں میں جب سورج آگ برسا رہا تھا اور پرندے اپنی زبانیں لٹکائے سایہ ڈھونڈتے پھرتے تھے تو ایک دن پچھلے پہر ایک اجنبی مسافر ہمارے گاؤں میں آیا اس کی عمر کوئی پینتیس چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس نے کندھے پر لکڑی کا ایک صندوق اٹھا رکھا تھا۔ پسینے سے شرابور، چپلوں کے و تدر کھلے ہوئے، بال بکھرے ہوئے۔ تھکی ہوئی آنکھوں میں بے نیند راتوں کا عکس۔

مسافر نے برگد کے درخت کے پاس پہنچ کر صندوق کندھے سے نیچے اتار دیا اور سائے میں بیٹھ گیا۔ جہاں میرے گاؤں کے کچھ بزرگ بھی بیٹھے ہوئے تھے اس جدید سائنسی دور میں اب بھی میرے گاؤں کے بزرگ دن ڈھلتے ہی برگد کے نیچے پکے تھڑے پر حقے لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر رات گئے تک سیاست، حکومت، گاؤں کے جھگڑوں، فصلوں، کیڑے مار دواؤں، محکمہ نہر کے کارندوں، پٹواری، قانون گو کے دفتر کے ملازمین اور علاقہ مجسٹریٹ کے ریڈر کے بارے میں دنیا جہان کی باتیں ہوتی ہیں۔ گاؤں میں جب کوئی جھگڑا ہوتا ہے اور میرے گاؤں کے لوگ ڈنڈوں، کلہاڑیوں اور بندوقوں کی گولیوں

سے ایک دوسرے کو زخمی کر دیتے ہیں یا کوئی قتل ہو جاتا ہے تو تھانیدار بھی تفتیش کے لئے اسی برگد کے نیچے میز ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ باری باری گواہوں کو بلاتا ہے اور ان کے بیان لیتا ہے۔ دوسرے دیہات کے لوگوں کی طرح میرے گاؤں کے لوگ بھی تھانیدار سے بہت ڈرتے ہیں۔ جب تھانیدار کرسی پر بیٹھ جاتا ہے تو ارد گرد بھی چارپائیوں پر وہ لوگ بیٹھ جاتے ہیں جو تھانیدار کی نظروں میں معزز ہوتے ہیں۔ ٹھنڈے یخ شربت سے بھرے ہوئے جگ آ جاتے ہیں۔ سگریٹ کے پیکٹ کا منہ کھول کر اسے میز پر رکھ دیا جاتا ہے۔ گاؤں کی سب سے اچھی کڑھائی کرنے والی لڑکی کے ہاتھ کا کڑھا ہوا میز پوش عام طور پر شربت اور راکھ سے خراب ہو جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ گاؤں کے ملنگ تھانیدار سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں اور تھانیدار کی آمد سے بہت پہلے برگد کے نیچے چھڑکاؤ کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے گاؤں کے لوگوں کا خیال ہے کہ تھانیدار صاحب جس کو جی چاہے شامل تفتیش کر لیتے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمارے گاؤں کے اس برگد کی شہرت دور دور تک ہے۔ لیکن یہ بات مصدقہ ہے کہ جب بھی کوئی مسافر ہمارے گاؤں میں آتا ہے تو سب سے پہلے اسی برگد کے نیچے آ کر بیٹھتا ہے۔ اس برگد کے بارے میں کچھ اور روایات بھی مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی برگد کے نیچے بیٹھ کر جھوٹ بولتا ہے تو اسے سانپ ڈس لیتا ہے۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا کیونکہ میرے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو سانپ نے نہیں ڈسا۔

ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ کسی زمانے میں ہمارے گاؤں میں ایک مشہور ڈاکو رہا کرتا تھا اور اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ رات کے اندھیرے میں خط لکھ کر اس برگد کی کھوہ میں رکھ جایا کرتا تھا اور اس کی محبوبہ پو پھٹنے سے پہلے وہ خط وہاں سے نکال لیا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے پڑھا تھا کہ جرمنی کے کسی گاؤں میں

بھی ایک ایسا ہی درخت ہے جسے لَوٹری کہتے ہیں۔ پہلے وہاں مالی کی بیٹی اپنے محبوب کے خط چھپا کر رکھا کرتی تھی اور آہستہ آہستہ اب یہ حال ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو اس لَوٹری کے پتے پہ خط لکھتے ہیں۔ ساتھی کی تلاش اسی لوٹری کے لیٹر بکس کے ذریعے ہوتی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمارے گاؤں کے برگد کو بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو جرمنی کے گاؤں کے لَوٹری کی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میرے گاؤں کے برگد نے سچائی کی تلاش میں میرے گاؤں کے لوگوں کی بڑی مدد کی ہے۔ اسی لیے تو وہ اجنبی مسافر بھی اپنا لکڑی کا صندوق اٹھائے سیدھا برگد کے سائے تک پہنچا۔

یہ بات تو بہت لمبی ہے کہ تعارف کا سلسلہ کیسے شروع ہوا۔ لیکن رات گئے تک گاؤں کے لوگوں میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ گاؤں میں ایک اجنبی مسافر آکر ٹھہرا ہے اور کہتا ہے کہ پرانے وقتوں کی کہانیوں کے کردار اکثر سچائی کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتے تھے۔ مگر وہ مسافر سچائی کا گھر ڈھونڈنے نکلا ہے۔ وہ یہ تو جانتا ہے کہ سچائی کیا ہے مگر یہ جاننا چاہتا ہے کہ سچائی کہاں رہتی ہے۔

اس جدید دور میں میرے گاؤں کے لوگ بھی ضرورت کے تحت جھوٹ بول لیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ سچائی کو پسند کرتے ہیں اس لئے اجنبی مسافر کی بات ان کے دل کو لگی اور انہوں نے اجنبی مسافر کو اپنے گاؤں میں رہنے کی اجازت دے دی۔ تاکہ وہ سچائی کا گھر ڈھونڈ سکے۔ لیکن ساری مصیبت اس لکڑی کے صندوق کی تھی۔ جسے وہ مسافر ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کرتا تھا۔ جب وہ برگد کے پیڑ کے قریب ہی ایک بوسیدہ سے گھر میں رہنے لگا تو بھی ہر وقت وہ صندوق اس کے کندھے پر رہتا تھا۔ اسی لئے تو گاؤں کے لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ مسافر کے صندوق میں سونا، ہیرے اور جواہرات ہیں۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اجنبی اجنبی نہ رہا اور وہ گاؤں کا ایک فرد بن

گیا۔ اس نے منڈی میں ایک آڑھتی کے ہاں ملازمت کرلی اور سارا سارا دن بڑی توجہ اور محنت سے اپنا کام کرتا مگر اس کے معمول میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ وہ صبح کندھے پر اپنا لکڑی کا صندوق رکھ کر گھر سے نکلتا اور جب شام پڑے گھر لوٹتا تو بھی لکڑی کا وہ صندوق اس کے کندھے پہ ہوتا۔ کئی بار گاؤں کے لوگوں نے اس سے سوال کیا کہ کیا اس نے سچائی کا گھر ڈھونڈ لیا ہے تو وہ یہی جواب دیتا۔ میں آخر سچائی کا گھر ڈھونڈ کر دم لوں گا اور پھر وہ کئی کئی دن گاؤں سے غائب رہنے لگا۔ لمبے سفر کے بعد جب وہ گاؤں لوٹتا تو لکڑی کا وہ صندوق اس کے کندھے پہ ہوتا۔ ایک دن مسافر نے ہمارے گاؤں سے کہیں اور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ برگد کے نیچے تھڑے پر بیٹھا تھا۔ لکڑی کا صندوق اس کے پاس پڑا تھا اور میرے گاؤں کے بزرگ اس سے گاؤں چھوڑنے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سچائی ان کے گاؤں میں نہیں رہتی۔ اسی لئے تو مسافر ان کا گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ انہوں نے مسافر کو روکنے کی کوشش کی لیکن مسافر انہیں رنجیدہ چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس بات کو کئی سال بیت گئے مگر ہمارے گاؤں کے لوگوں کی باتوں سے اس مسافر کی مہک آتی رہی۔ ہمارے گاؤں سے گزرنے والے مسافر بھی اس کے بارے میں معلومات لاتے رہے..... مگر پھر ایک دن ایک اطلاع نے ہمارے گاؤں کے لوگوں کو اداس کر دیا..... مسافر کو کسی نے قتل کر دیا تھا اور اس کا صندوق لے کر بھاگ گیا تھا.... کہتے ہیں جب قاتل نے صندوق کھولا تو اس میں ایک کنگھی، ایک جوڑا سلیپر اور ایک کفن تھا۔ اور ایک چٹ پہ لکھا تھا۔

"یہ کنگھی اس کی ہے۔ اس کنگھی سے وہ اپنے بال سنوارا کرتی تھی..... یہ سلیپر بھی اس کے ہیں..... مگر یہ کفن میرا ہے"۔ تب یہ بات سن کر میرے گاؤں کے ایک بزرگ نے کہا۔
سچائی کا گھر تو وہ اپنے کندھوں پہ اٹھائے پھرتا تھا۔
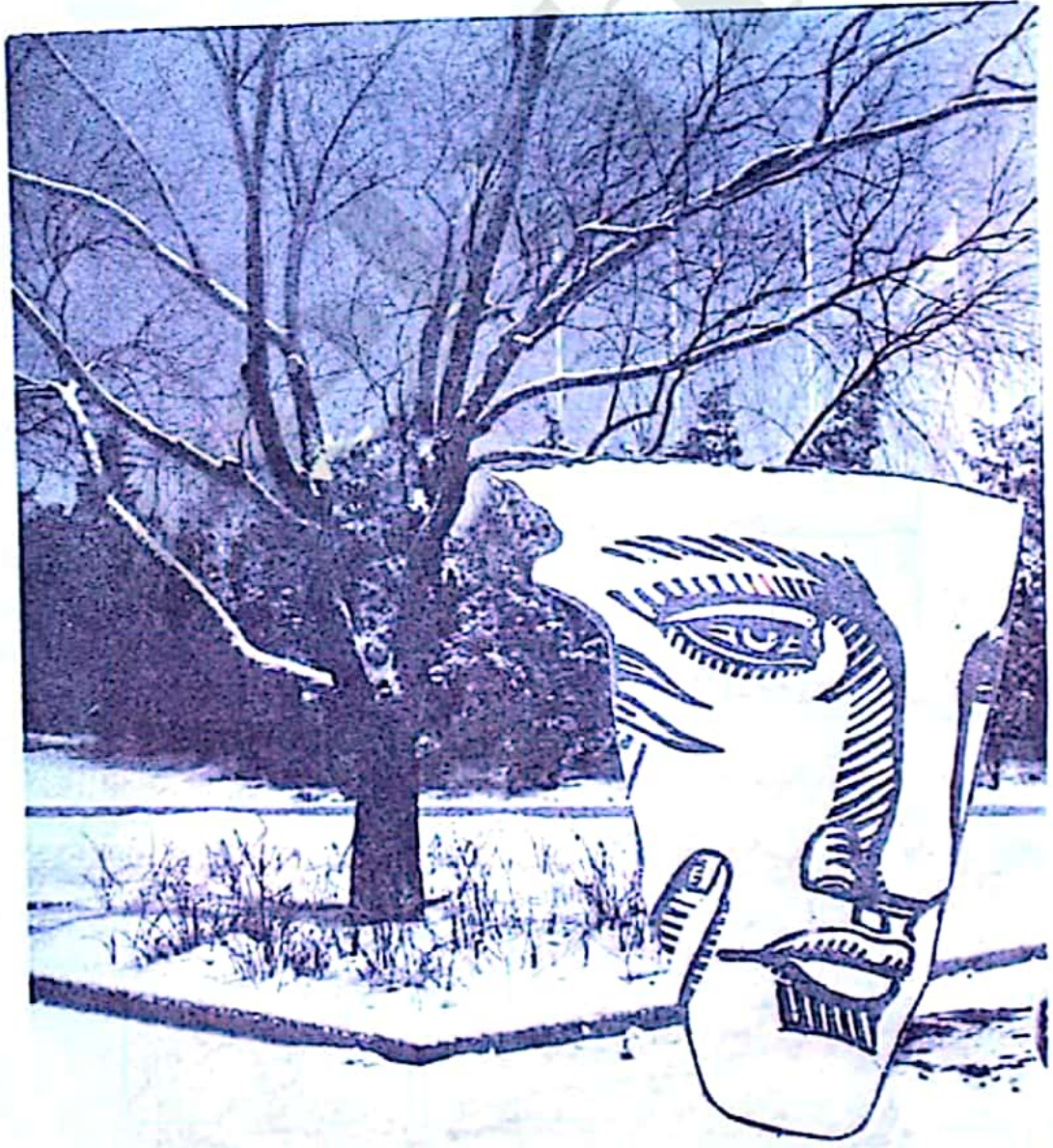
ایک کہانی بھُلا دینے کے لیے

آدھی رات کے وقت وہ بھی آگیا اور بولا۔ میں وہ کالی بس بھی لے آیا ہوں آؤ آج تمہیں دفن کر دیں۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا تم وعدے کے بڑے پکے ہو اور وقت کے بھی پابند ہو۔ تم واقعی ایک اچھے دوست ہو۔

اس نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا اور بولا۔ میں تو اس سے پہلے ہی آجاتا، مگر آج یہ کالی بس سارا دن بہت مصروف رہی۔ شہر میں چھ موتیں ہوئیں اور آخری جنازہ اٹھانے میں بہت دیر ہو گئی۔ اب شہر میں اس ایک بس کے سوا اور تو کوئی انتظام ہے نہیں۔ یار یہ کالی بس بھی بڑی دلچسپ ہے۔ دوسری بسوں میں تو جگہ نہیں ملتی مگر اس بس میں مرحوم کو بالکل ڈرائیور کے ساتھ جگہ ملتی ہے۔

چلو پھر جلدی کرو تمہیں دفن کر آئیں۔ تم پوری طرح مر چکے ہو نا؟

تو اب پوچھ رہے ہو مجھے تو مرے ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں۔ یاد کرو میں تمہیں کتنے دنوں سے کہہ رہا ہوں کہ کسی دن وقت نکال کر آ جاؤ اور مجھے دفن کر آؤ۔

آؤ پھر تمہاری پسندیدہ بس باہر کھڑی ہے۔ جا کر ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے خالی جگہ پر لیٹ جاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لئے مسجد سے ڈولی نہیں لا سکا۔

ٹھہرو میں اپنے بچپن کے دوست کو خط لکھ لوں میں کاغذ اور قلم اٹھانے کے لئے میز کی طرف بڑھا۔ میرا دوست دوسرے ملک میں ہے ذرا اسے اطلاع دے دوں کہ میں مر گیا ہوں اور آج رات مجھے دفن کیا جا رہا ہے۔

مردے خط نہیں لکھتے۔ اس نے مجھے روک دیا۔ کوئی خود ہی اسے تمہارے مرنے کی اطلاع کر دے گا۔

"لیکن میں اپنی محبوبہ کو تو خط لکھ دوں۔"

"بے وقوف مت بنو مرا ہوا آدمی محبوبہ کا نہیں بیوی کا ہوتا ہے۔ اس کے لئے یہ خط بالکل فضول ہوگا۔ البتہ اپنی بیوی کو اپنی موت کی اطلاع ضرور دے دو اور اس کے لئے خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اطلاع میں تمہاری بیوی کو پہنچا دوں گا اور اسے یہ بھی بتا دوں گا کہ میں نے تمہیں تمہاری مرضی کی جگہ دفن کر دیا ہے۔ وہ روئے گی ماتم کرے گی۔ زندہ اور صحت مند آدمی محبوبہ کا اور بیمار اور مرا ہوا آدمی بیوی کا ہوتا ہے۔"

"یہ تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ تو کیا میں ٹیلی فون پر اپنی بیوی کو اپنے مرنے کی اطلاع دے دوں۔"

"ایسا نہ کرنا ورنہ تمہاری آخری رسومات میں بہت دیر ہو جائے گی۔ تمہاری بیوی زیادہ سے زیادہ وقت تمہاری میت کے سرہانے بیٹھنے کی کوشش کرے گی اور ہو سکتا ہے یہ یقین کرنے کے لئے کہ کیا واقعی تم مر چکے ہو، ڈاکٹروں کو بلا لے۔ کیا پتہ وہ تمہیں دفن ہی نہ کرنے دے۔ میں اسے اطلاع کر دوں گا اور تمہاری قبر کی نشاندہی بھی کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے مگر کیا تم اکیلے یہ کام کر سکو گے۔ کہو تو میں اپنے دوست کو ساتھ لے لوں۔ اسے میری آخری رسومات میں شرکت کر کے خوشی ہو گی۔ دوستوں کو تو قبر پہ مٹی ڈالنی ہی چاہیئے۔"

"کون سا دوست؟"

"وہی جس سے تم اس دن ملے تھے ۔"

"نہیں ...... ہم اکیلے جائیں گے ۔ میں کسی خطرے کے پیشِ نظر یہ نہیں کہہ رہا ہوں ۔ بلکہ کیا پتہ وہ تمہاری قبر کھودنے اور تمہاری میت کے ساتھ قبرستان جانے کا معاوضہ طلب کرے ۔ اس کی تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے ۔ وہاں ہر بات کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی ہے ۔ وہ تم سے کیا محبت کرے گا ۔ وہ تو یک طرفہ محبت کا قائل ہے ۔ وہ تو موت کے بعد کی زندگی پہ یقین نہیں رکھتا ۔ کیا پتہ اسے جب تمہاری موت کا علم ہو تو وہ تم سے دوستی کا رشتہ ہی توڑ دے ۔ کیونکہ وہ تو زندگی پہ یقین رکھتا ہے اور موت سے پہلے پہلے اس زندگی سے پورا پورا مزہ اور فائدہ اٹھا لینا چاہتا ہے ۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وہ واقعی ہر بات میں فائدہ تلاش کرتا ہے ۔ وہ صرف اپنی غرض کا خیال رکھتا ہے ۔ وہ ایک انتہائی سخت دل آدمی ہے ۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اس کی تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ دنیا کے ہر رشتے کی بنیاد غرض پہ ہوتی ہے ۔ وہ کسی کے لئے قربانی دینا گناہ سمجھتا ہے ۔

"چلو پھر اٹھو ! رات تیزی سے بیت رہی ہے ۔"

میں نے جلدی سے اپنی کچھ ضروری کتابیں سمیٹیں ، اپنا قلم اٹھایا ۔ کچھ سادہ کاغذ لئے اور انہیں بیگ میں رکھتے ہوئے اس سے کہا ۔ "یہ بیگ بھی میرے ساتھ دفن کر دینا ۔"

وہ کرسی سے اٹھا ۔ ایش ٹرے میں سگریٹ بجھایا اور بیگ میرے ہاتھ سے لے کر دروازے کی طرف بڑھا ۔ میں نے اپنے کمرے میں آخری نظر ڈالی اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ۔ سامنے کالی بس اندھیرے کا حصہ بنی کھڑی تھی ۔

جب وہ ڈرائیور کی سیٹ پہ بیٹھ گیا تو میں اس کی سیٹ کے پیچھے میت کی جگہ پہ لیٹ گیا ۔ اس نے بس اسٹارٹ کی اور گیئر لگا کر اس کا رُخ قبرستان کی طرف موڑ دیا ۔

میرے دل میں ایک خیال آیا تو میں نے کہا۔ "میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم وقت نکال کر مجھے دفن کرنے آتے ہو۔ تم نے یہ بھی اچھا کیا کہ مجھے کسی کو خط نہیں لکھنے دیا مگر اس وقت مجھے ایک بوسے کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے میرے چہرے پر موت دیکھ کر کوئی تو ایسا ہوگا جو مجھے بوسہ ضرور دیتا۔ یہ جان کر بھی کہ میں مر چکا ہوں، وہ مجھ سے لپٹ جاتا۔"

"مگر ایک اور بات بھی تو ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہو سکتا ہے تمہارے گھر والوں کو تمہاری موت پر یقین ہی نہ آتا۔ وہ تمہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر موت کی نیند سے جگانے کی کوشش کرتے۔ سگریٹ سلگا کر تمہارے ہاتھ میں پکڑا دیتے اور اصرار کرتے کہ سگریٹ پیو۔ آج تم سگریٹ کیوں نہیں پی رہے ہو۔ اُن کی چیخیں تمہارا دل ہلا کر رکھ دیتیں۔ تمہارے بچے تمہیں ایسا کرنے سے روکتے اور کیا پتہ اپنے بیٹے کا بوسہ تمہیں پھر سے زندگی کی حرارت سے آشنا کر دیتا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

اتنے میں بس رکی اس نے دروازہ کھولا اور نیچے کودتے ہوئے بولا: "آؤ تمہاری قبر کے لئے جگہ منتخب کریں۔"

اندھیرے میں ہم دونوں قبروں کے بیچوں بیچ چلتے جا رہے تھے کہ ایک جگہ وہ رک گیا اور قبروں کے درمیان ایک خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ جگہ تمہاری قبر کے لئے ٹھیک رہے گی؟"

میں نے ارد گرد کی قبروں پر لگے کتبوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تمہیں پتہ ہے کہ میں قبرستان آتا رہتا ہوں اور اکثر قبروں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں یہاں ارد گرد خود غرض اور لالچی لوگوں کی قبریں ہیں۔ میں زندگی بھر ایسے لوگوں سے بچتا

رہا ہوں تو اب موت کے بعد مجھے ان کے سپرد کیوں کر رہے ہو؟ وہ پی آر کی محفلیں منعقد کرتے رہیں گے۔ مجھے کوئی الگ تھلگ اور خاموش جگہ چاہیئے۔

میری بات سن کر وہ کچھ کہے بغیر آگے چل پڑا اور تھوڑی دور تک چپ چاپ چلنے کے بعد ایک جگہ پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبریں دیکھ کر ٹھہر گیا اور بولا تمہاری قبر کے لئے یہ جگہ ٹھیک رہے گی۔

"کہیں تم مجھے پھولوں کا لالچ تو نہیں دے رہے۔ جب میری قبر پہ پھول ڈالنے کوئی نہیں آئے گا تو مجھے دوسروں کی قبروں پہ پڑے ہوئے پھولوں سے کیا لینا۔ ویسے بھی میں ایسے لوگوں کی کمپنی کے لائق نہیں۔ جن کے دوست اور عزیز انہیں ابھی تک یاد رکھے ہوتے ہیں۔ ان کے مرجانے کے بعد بھی ان کا احترام کر رہے ہیں۔ ان سے پیار کر رہے ہیں۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے غور سے پھولوں کو دیکھا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے اب تم اپنی قبر کے لئے کوئی جگہ پسند کر ہی لو۔ کیونکہ وقت بہت کم ہے اور ابھی تمہاری قبر بھی کھودنی ہے۔"

چند قدم چل کر اس نے قدرے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میرے خیال میں یہ جگہ ٹھیک ہے۔ تم یہیں ٹھہرو میں بھاگ کر بس میں سے کدال اور بیلچہ لے کر آتا ہوں۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کہ وہ تیزی سے بس کی طرف چلا گیا۔ جب تک وہ واپس آیا میں اردگرد کی قبروں کے کتبے پڑھ چکا تھا۔ جونہی وہ میرے قریب آیا اور میں نے اندھیرے میں لپٹی اس کی سانسوں کی آواز سُنی تو کہا۔

"نہیں یار! یہ جگہ بھی ٹھیک نہیں۔ یہاں اردگرد جھوٹے اور خوشامدی لوگوں کی قبریں ہیں۔"

اس نے کندھے پر کدال اور بیلچے کو درست کیا اور بولا۔

"چونکہ یہ تمہاری قبر کا مسئلہ ہے اور میں نے تمہیں دفن کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اس لئے میری کوشش یہی ہو گی کہ جگہ تمہاری پسند کی ہو۔"

"تو پھر میری ایک بات مانو تم۔ میری قبر اس جگہ کھود دو جہاں ارد گرد بچوں کی قبریں ہوں۔ میں اس چالاکی جھوٹ اور فریب سے تنگ آگیا ہوں۔ بچوں کی معصومیت اور بے لوث محبت مجھے اچھی لگتی ہے۔"

وہ تیزی سے مُڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

بچوں کی قبروں کے قریب پہنچ کر اس نے کدال اور بیلچہ کندھے سے اتارا، قمیص کے بازو چڑھائے اور میری قبر کھودنے لگا۔ میں اس کی مدد کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ مگر اس نے مجھے روک دیا اور بولا۔ "مردے اپنی قبریں خود نہیں کھودا کرتے۔"

میں چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ میری قبر کھودنے لگا۔

میرے دل میں ایک خیال آیا تو میں نے کہا "یار ایک لوک کہاوت یہ ہے کہ قبریں بھی ماں کی طرح ہوتی ہیں اور وہ یوں ہمارا انتظار کرتی رہتی ہیں، جیسے مائیں اپنے بچوں کا انتظار کرتی ہیں۔"

میری بات کا جواب دیئے بغیر وہ میری قبر کھودتا رہا۔ کدال کی آواز آہستہ آہستہ گہرائی میں اترتی جا رہی تھی۔ اس کے سانس تیز ہوتے جا رہے تھے۔ آواز میں تھکاوٹ گھلتی جا رہی تھی، یہ جان کر کہ وہ بہت زیادہ تھک گیا ہے، میں نے ایک بار پھر اصرار کیا۔

"لاؤ یار میں تمہاری مدد کرتا ہوں، اکیلے آدمی کے لئے قبر کھودنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

وہ میری بات ماننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لئے بات پلٹنے کے لئے بولا۔

"کیا تم اپنے لئے کفن لے آئے ہو؟"

"ہاں اس بیگ میں ہے۔" لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ سلیں نہیں ہیں تو میں نے اس سے کہا۔

"تم قبر کھودو، میں سلیں اکٹھی کر کے لاتا ہوں۔"

"نہیں، وہ بھی میں خود لاؤں گا، تم مر چکے ہو اور مرا ہوا آدمی اپنی قبر کے لئے سلیں اٹھا کر کیسے لا سکتا ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ کہاں پڑی ہیں۔ گورکن کی کوٹھڑی کی پچھلی دیوار کے ساتھ ڈھیر لگا ہوا ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ وہ قبر کھودتا رہا۔ پھر جب مجھے احساس ہوا کہ قبر کی گہرائی قریباً مکمل ہو گئی ہے اور وہ اس میں اتر کر اب بیلچے سے مٹی باہر پھینک رہا ہے۔ تو میں نے کہا۔

"ذرا دھیان سے، خیال رکھنا یہاں سانپ اور زہریلے کیڑے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ اب تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔" اب اس کی آواز سے مشن کی کامیابی کی تازگی پھوٹ رہی تھی۔ میں نے بیگ کھول کر اس میں پڑا کفن چیک کیا۔ اتنے میں ہاتھ جھاڑنے کی آواز آئی تو میں نے پوچھا۔

"کھدائی مکمل ہو گئی کیا؟"

"نہیں، ابھی تھوڑی سی باقی ہے۔ میں ذرا سلیں لے آؤں۔ کہیں اتنے میں گورکن نہ جاگ پڑے۔"

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ تیزی سے قبروں کے بیچوں بیچ گورکن کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا اور تھوڑی دیر میں کندھے پہ سلیں اٹھائے آ گیا اور بولا۔

"ابھی ایک پھیرا اور لگے گا۔ دو چار سلیں فالتو ہو جائیں تو کوئی بات نہیں۔ اگر اس وقت کم پڑ گئیں تو وہاں سے لانی مشکل ہو جائیں گی۔"

اس نے ایک ایک کر کے سلیں زمین پہ پھینکیں۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"بس میں ابھی آیا۔" اور مزید سلیں لانے گورکن کی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔

جب وہ مزید سلیں لے آیا تو پہلے اس نے ساری سلوں کو بلند آواز میں گنا اور پھر قبر کھودنے میں مصروف ہو گیا۔ اب کدال چلنے کی آواز میں تیزی آ گئی تھی۔

جب قبر کی کھدائی مکمل ہو گئی تو وہ میرے پاس آیا اور بولا۔

"چلو اب کفن پہن لو۔ قبر مکمل ہو گئی ہے۔"

میں نے جلدی سے بیگ کی زپ کھولی۔ کفن باہر نکالا اور اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ اس نے کفن میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔

"مردے خود کفن نہیں پہنتے۔ تم اپنے پہلے والے کپڑے اتار لو۔ کفن میں تمہیں خود پہناؤں گا۔"

جب وہ مجھے کفن پہنا چکا تو بولا۔ "کافور کہاں ہے؟"

میں نے بتایا کہ مجھے کافور کی خوشبو اچھی نہیں لگتی۔

"اگر تم کافور لے آتے تو اچھا تھا۔ کیڑے پاس نہیں آتے۔"

میں اپنی قبر کی طرف چل پڑا۔ مگر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روکا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو میں خود چل کر قبر میں لیٹ جاتا ہوں۔ تم پٹیاں رکھ کر مٹی ڈال دینا۔" مگر اس نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا اور بولا۔

"مردے خود اپنی قبروں میں نہیں لیٹا کرتے میں تمہیں خود....."

اس نے آگے بڑھ کر مجھے کندھے پر اٹھا لیا اور بڑی کوشش سے مجھے قبر میں لٹا دیا۔

ہم دونوں چپ تھے ــــ اس نے دوسری سل رکھی تو بولا۔

"کیا تم نے سب کو بتا دیا تھا کہ تم آہستہ آہستہ مر رہے ہو؟"

"ہاں میں نے سب کو بتا دیا تھا۔ مگر وہ یہی کہتے رہے کہ تم نہیں مرو گے۔"

"اور تم مر گئے۔"

"بالکل..... اب میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔"

پھر اس نے بیلچے سے میری قبر بھرنی شروع کی۔ اور جب قبر مکمل ہو گئی تو اس نے میری وصیت کے مطابق میری طرف سے بھی مٹھی بھر مٹی میری قبر پہ ڈالی۔ دعا پڑھی اور بس کی طرف چلا گیا۔

اب اس بات کو ایک سال ہونے کو ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مر چکا ہوں۔

آنکھیں نیند سوچتی ہیں

رت جگوں کے موسم میں اس کی نیند سے بھری آنکھیں دیکھ کر مجھے اس پر رشک آگیا تو میں نے اس سے کہا "آج کل مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ نیند آور دوائیاں کھا کھا کر میرا برا حال ہو گیا ہے۔ تم میرے بہت ہی پیارے دوست ہو۔ دوست تو دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔ کوئی حل بتاؤ۔"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔" نہ سونا تو تمہاری عادت ہے۔"

میں نے اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔" بخدا یہ میری عادت نہیں۔ کون چاہتا ہے کہ وہ ساری رات سولی پر لٹکتا رہے۔ ساری رات میرا ذہن سلگتا رہتا ہے۔ سوچیں گدھوں کی طرح میرے زندہ جسم کو نوچتی رہتی ہیں۔ کسی دن تم میرے نروس بریک ڈاؤن کی خبر سنو گے۔"

اس نے لمبی جمائی لی اور بولا۔" تم ایک عام آدمی نہیں ہو، اس لئے بھگتو.... عام آدمی نہ ہونے کا کچھ جرمانہ تو بھرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی تمہیں مرنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن پھر اسے مجھ پر ترس آگیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ لپیٹ لی، اور قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔" میں تمہیں ایک طریقہ بتاتا ہوں۔ اگر تم نے اس پر عمل کیا تو تمہیں گہری نیند آجایا کرے گی۔"

"وہ کیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ جب تم رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹو تو آنکھیں بند کر کے یہ تصور کرو کہ تم میرے ساتھ سفر پہ روانہ ہو رہے ہو۔"

میں ابھی اس کی اس بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ وہ یہ کہہ کر کہ اسے بہت نیند آرہی ہے، اٹھ کر چلا گیا۔

رات کو جب میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور تصور ہی تصور میں اپنے اس دوست کے ساتھ سفر کرنے کے لئے سامان باندھنے لگا۔ پھر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی آ گیا اور بولا۔ "جاؤ اب جا کر ٹکٹ خرید لاؤ۔"

"کہاں کے ٹکٹ لاؤں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اسٹیشن کا نام بتایا۔

میں جلدی سے ٹکٹ لے آیا۔ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر کھینچا۔ جلدی کرو، ٹرین اس اسٹیشن پر بہت کم رُکتی ہے۔

گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کو پیچھے چھوڑنے لگی۔ پلیٹ فارم پر بہت سے ہلتے ہوئے ہاتھ لمحہ بہ لمحہ فاصلے کی اوٹ میں غروب ہونے لگے۔ ڈبے میں بیٹھے مسافر رات کے وقت ڈربے میں بیٹھی مرغیوں کی طرح اونگھ رہے تھے۔ میرا دوست میرے قریب بیٹھ گیا اور پھر یکدم سردی محسوس کر کے میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا اور بیگ سے کمبل نکال کر آدھا مجھ پہ اور آدھا کمبل اپنے اوپر ڈالتے ہوئے بولا۔

دیکھنا اب تمہیں کتنی جلدی نیند آجائے گی۔ دیکھو سب لوگ کتنے مزے سے سو رہے ہیں۔ اس نے ایک نظر مسافروں پہ ڈالی اور پھر یکدم کمبل ہٹا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "یار وہ سامنے میرا ایک پرانا دوست بیٹھا ہوا ہے۔ میں ذرا اس سے مل کر آتا

ہوں۔ فکر نہ کرنا ابھی آیا۔ تم سونے کی کوشش کرو۔"

میں پھر اکیلا رہ گیا۔ وہ سامنے اپنے دوست کے پاس بیٹھا کسی بات پر بے اختیار ہنس رہا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی۔ مگر ہمیشہ کی طرح سوچوں نے لمبی لمبی چونچوں والی چڑیوں کی طرح میری نیند کو چُگ لیا۔

ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ واپس آئے تو میں سو جاؤں۔ کتنی دیر وہ اپنے دوست کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا، ہنستا رہا اور جب اس کے دوست نے اکتا کر جماہیاں لینی شروع کر دیں تو وہ پھر میرے پاس آگیا اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا: "تم ابھی تک سوتے نہیں۔ معاف کرنا مجھے وہاں کچھ دیر لگ گئی۔ دراصل وہ میرا بہت ہی پرانا دوست ہے۔ کچھ عرصہ سے ہم ایک دوسرے سے ناراض تھے۔ لیکن تمہیں پتہ ہی ہے پرانے دوست کسی محفل میں نظر آ جائیں تو ساری رنجشیں پل بھر میں ختم ہو جاتی ہیں۔ ویسے وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ ہم بہت ہی معمولی بات پر ایک دوسرے سے روٹھ گئے تھے۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے۔ جب بھی میں اس سے ملاقات کے لئے وقت مانگتا تھا وہ کوئی بہانہ بنا دیتا تھا۔ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس کا دل بہت خوب صورت ہے۔ وہ میری بے حد عزت کرتا ہے۔"

گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی۔ کچھ مسافر سوار ہوئے ان میں سے ایک میرے دوست کا واقف کار بھی تھا۔ وہ تاش چھوڑ کر اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور کتنی دیر تک قہقہے لگاتا رہا.... پھر اچانک اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ ٹٹولتا ہوا واپس میرے پاس آگیا اور بولا "تم ابھی تک سوئے نہیں۔"

"سوتا کیسے.... تم میرے ساتھ رہتے ہی نہیں.... میں تنہا رہ جاتا ہوں۔ تم نے میرے ساتھ سفر کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب تمہارے اندر سے کوئی اور شخص باہر آگیا ہے۔"

اس نے پھر جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔" میرے پیسے۔"

"پیسوں کی فکر نہ کرو۔ پیسوں کے علاوہ کوئی اور گفتگو کرو۔ مجھے پیسوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ محبت کی بات کرو، دوستی کی بات کرو۔"

اس نے پہلو بدلا "محبت کیا ہے، غرض ہے۔ محبت کچھ نہیں ہوتی۔

یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔

پلیز ایسی باتیں نہ کرو۔ اس طرح تو میری نیند بالکل اڑ جائے گی۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سمندر کی طرح کھلا صاف شفاف چہرہ مگر دل کسی تنگ گلی کی طرح۔ میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر مجھے اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی مگر وہ ابھی تک سو رہا تھا اور میں اس کے سرہانے بیٹھا اس کی نیند کی رکھوالی کر رہا تھا۔ یقیناً اس وقت اگر میں سو رہا ہوتا تو وہ مجھے سویا ہوا چھوڑ کر چلا گیا ہوتا۔ وہ کسی نے ٹھیک کہا ہے کسی شخص کو جاننا ہو تو اس کے ساتھ سفر کرو۔ سفر سے پہلے اس کا لہجہ بہت دھیما تھا اس کی باتوں میں معصومیت تھی۔ لیکن گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ یکدم بدل گیا۔ جو مجھے سلانے کے لئے لایا تھا خود گہری نیند سو رہا تھا اور میں جاگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ شام کے وقت کی بچی کھچی دھوپ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر دنیا میں خوش رہنے کا کوئی نسخہ ہو تو وہ میرے اس دوست کو ملنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے کیسے کیسے لوگ پیدا کئے ہیں۔ جن کے دل درد سے عاری ہیں۔ جن کی آنکھوں میں کبھی پیار نہیں اترا۔ جن کی کوئی کومٹ منٹ نہیں۔ وہ صرف اس زندگی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ انہوں نے موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔

اتنے میں میرا دوست بڑبڑا کر اٹھا، "میرے پیسے"۔
میں نے اسے تسلی دی۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ کوئی نہیں لیتا تمہارے پیسے۔ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے۔ ایسی بات دل سے نکال دو۔ میری نظر تمہارے پیسوں پر نہیں، تمہاری دوستی پر ہے۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جب تک تم میرے ساتھ سفر کر رہے ہو میری خواہش ہے کہ تم ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرو۔

میں پیسے کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔ میں پیسے کو بالکل اہمیت نہیں دیتا۔ وہ ناراض لہجے میں بولا: "میں جب سے تمہارے ساتھ سفر کر رہا ہوں میں نے کوئی مطالبہ کیا ہے تم سے۔"

"نہیں بالکل نہیں، لیکن اب خدا کے لئے پیسے کی باتیں چھوڑ دو" اس خوف سے رہا ہو کر میرے ساتھ سفر کرو۔ اب میرے ساتھ آ گئے ہو تو میرے ساتھ رہو۔"

"تمہارے ساتھ سفر کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں سب کو بھول جاؤں۔ بہت سے لوگوں سے میری دعا سلام ہے۔ بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں۔"

میں نے اپنے دوست کی بات کاٹ کر کہا "ٹھیک ہے وہ تمہارا پرانا دوست ہے۔ تم اس سے بے حد محبت کرتے ہو۔ لیکن تم نے میرے ساتھ سفر کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تم میرے ساتھ آئے ہو .... اگر تم نے میرے ساتھ سفر نہ کیا تو مجھے نیند کیسے آئے گی۔ اب ہم اکٹھے چل ہی پڑے ہیں تو خدا کے لئے میرے ساتھ رہو۔"

اس نے بڑی لاپرواہی سے میری بات سنی اور پھر اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"میرے پیسے۔"

میں نے کہا "اطمینان سے دیکھو، تمہارے پیسے کہیں نہیں جاتے، یہیں ہوں گے۔ تمہیں اپنے پیسوں کی اتنی فکر کیوں پڑ گئی ہے۔ کیا تمہیں ڈر ہے کہ میں تمہاری جیب

کاٹ لوں گا۔"

"نہیں یہ بات تو نہیں، پھر بھی اپنے پیسوں کا خیال رکھنا۔ چاہیئے۔ تم اپنے پیسوں کا خیال رکھو میں اپنے پیسوں کا خیال رکھوں گا۔"

"یہ تم نے پیسوں کی بات کیوں شروع کر دی ہے۔ ایسی فضول باتوں سے مجھے گھٹن ہوتی ہے۔ ہم دوست ہیں۔ لیکن میرے دوست نے میری بات سنی اَن سنی کر دی اور کتنی دیر تک اپنے گھر کی قیمتی اشیاء اپنی کار اور اپنے اس سفر کے قصے سناتا رہا جو اس نے فسٹ کلاس میں کیا تھا۔۔۔۔ اب اس کا لہجہ بھی بدل گیا تھا اور وہ کسی بیوپاری کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اس دوست کے بارے میں بھی بتایا جو کسی تنظیم کا وائس پریذیڈنٹ منتخب ہو گیا تھا۔

میں نے دل میں سوچا۔ اے خدا تو نے اس شخص کو کتنا خوب صورت چہرہ اور کھلی کھلی آنکھیں دی ہیں۔ کتنا لمبا قد دیا ہے۔ لیکن اس کا دل ایسا کیوں بنا دیا ہے۔ میں نے بریف کیس سے نیند آور گولیاں نکالیں اور انہیں بغیر پانی کے نگل کر آنکھیں بند کر لیں تاکہ مجھے نیند آ جائے۔ اتنے میں اس نے میرا کندھا ہلایا اور بولا یار وہ سامنے بیٹھا شخص بڑے مزے کے لطیفے سُنا رہا ہے۔ تم سونے کی کوشش کرو میں دو چار لطیفے سن کر ابھی آتا ہوں۔

"چھوڑو یار وہ بڑے گندے لطیفے سُنا رہا ہے۔" میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"ایسے لطیفے ہی تو مزے دار ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھا، اور لطیفے سنانے والے شخص کے پاس چلا گیا۔ کچھ دیر وہ ایک دوسرے کو لطیفے سناتے اور ہنستے رہے۔ پھر کسی نے تاش نکالا اور وہ تاش کھیلنے لگے۔ پتوں کے ساتھ ساتھ وہ غلیظ گالیاں بھی پھینٹتے رہے۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا وہ دوست جسے میں اچھی طرح سمجھتا تھا، جانتا تھا ایک معمہ بن گیا ہے۔ وہ جو کھلے صاف کاغذ کی طرح میرے ہاتھ لگا تھا۔ اب چار خانہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے خانوں میں میری نیند قید ہو گئی تھی۔ اور کسی بے بس چڑیا کی طرح ان خانوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر ہلکان ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے انجن کا سارا دھواں ڈبے میں آ گیا ہے۔ میری نیند دھواں دھواں ہو گئی۔ اس سے پہلے تو پھر کبھی ایک آدھ گھنٹے کے لئے مجھے نیند آ جایا کرتی تھی۔ لیکن آج تو ایک پل کے لئے بھی نیند نے میری آنکھوں میں پھیرا نہیں مارا۔ یہ کتنا عجیب اتفاق تھا کہ وہ جو مجھے نیند کے ذائقے سے آشنا کرنے آیا تھا، بے خوابی بن کر میری آنکھوں میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ زندگی کو بہت سہل سمجھتا ہے۔ اس کے لئے نیند بھی بہت آسان ہے۔ وہ دوستی کو بھی عام بات سمجھتا ہے۔ اس کے تعلقات کی دنیا بڑی وسیع ہے۔ اس لئے اب اگر میں سو بھی گیا تو وہ مجھے سوتا چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اچھائی اور برائی میں اس کے نزدیک کوئی فرق نہیں۔ بلکہ تھوڑی دیر پہلے جب میں نے اسے احساس دلایا کہ ڈبے میں چوہے ہیں اور اس کی کنگھی جو فرش پہ گر پڑی تھی وہ اسے بالوں میں نہ پھیرے تو اس نے کہا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چوہا کنگھی میں تو نہیں گھس گیا۔ اس سے پہلے مجھے اس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے چوہے سے بھی گھن نہیں آتی۔ اگر وہ میرے ساتھ سفر نہ کرتا تو شاید مجھے یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ میرے دوست کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت پیسہ ہے۔

ریل گاڑی اب رات کے آخری پہر میں داخل ہو گئی تھی۔ میرا دوست آہستہ آہستہ اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنے ساتھ لے جانے والی کوئی چیز نہیں بھولتا میں نے حسرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ کیا بات ہے۔ تم اپنا سامان سمیٹ رہے ہو۔" وہ بولا۔ "بس آخری اسٹیشن آنے والا ہے۔ اس کے بعد

اِس شہر میں ایک پُرانا کُنواں بھی تھا ،

صبح انہیں کنواں بھرنے کے لئے جانا تھا۔

جس دن سے کنواں بھرنے کا اعلان ہوا تھا۔ اس کا دل خوشی سے گونج اٹھا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے گھر سے نکلنا کم کر دیا تھا۔ اور گھر میں بیٹھ کر اپنا نامکمل کہانیاں اور ناول مکمل کرنے میں لگا رہتا۔ مگر جب سے کنواں بھرنے کا اعلان ہوا تھا کوئی چھوٹی موٹی چیز خریدنے کے بہانے وہ مارکیٹ کے کئی چکر لگا چکا تھا اور لوگوں کی آنکھوں میں کنواں بھرنے کی لگن ڈھونڈ رہا تھا۔ کنواں بھرنے میں اس کی دلچسپی صرف اس لئے نہیں تھی کہ اس کنویں نے پچھلی گرمیوں میں اس کے بیٹے کی جان لے لی تھی، بلکہ اس کی وجہ اور بھی تھی جس کے لئے کنویں کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔

یہ ایک بہت گہرا اور پرانا کنواں تھا اور شہر کے وسط میں منہ کھولے بیٹھا تھا۔ اس شہر کی کئی نسلوں نے اس کنویں کو بند کیا مگر کچھ عرصہ بعد کوئی پھر اس کا منہ کھول دیتا تھا یوں تو کنویں پانی فراہم کرتے ہیں لیکن یہ عجیب طرح کا کنواں تھا۔ پانی سے خالی، گھپ اندھیر کنواں جس میں سے ایک خاص طرح کی گیس خارج ہوتی تھی۔ جس سے شہر میں حبس پھیلتا تھا۔ لوگوں کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے الجھنے لگتے۔ بلکہ ایک ہی نظریے کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف ہو جاتے۔ ان کی

آنکھوں میں بیگانگی پھیل جاتی۔ لہذا اس شہر کی ہر نسل نے گذشتہ کئی سالوں میں اس کنویں کو کئی بار بھر کر اس کا منہ بند کر دیا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی اسے پھر سے کھول دیتا۔

اب کی بار صرف اسے ہی نہیں بلکہ شہر کے دوسرے لوگوں کو بھی یقین تھا کہ اب جب کنواں بھر جائے گا تو پھر کبھی نہیں کھلے گا۔ لیکن رات جب اس کی بیوی ناکارہ اور بے کار اشیاء اکٹھی کر رہی تھی اور وہ ہیٹر کے پاس بیٹھا گہری سوچوں میں گم تھا تو دور کہیں اس کے دل میں شک بھی کالی بلی کی طرح ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ بھئی باہر بلیاں لڑ رہی ہیں۔ دیکھو ایک بلی کے رونے کی آواز بھی آ رہی ہے۔ مگر اس کی بیوی نے اسے بتایا کہ یہ محض اس کا وہم ہے اور اسے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ کیونکہ اگر کسی گھر کی چار دیواری کے اندر بلی روتے تو یہ اس گھر کے لئے اچھا شگون نہیں ہوتا۔ بیوی کی بات سن کر کچھ دیر کے لئے تو وہ خاموش بیٹھا رہا مگر پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں صبح لوگ کنواں بھرنے کے لئے اکٹھے نہ ہوئے تو۔

اس کی بیوی کو اس کی گفتگو سے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سامان کے ڈھیر پر کچھ اور چیزیں رکھتے ہوئے بولی: تمہارے دل میں ایسے وہم کیوں آ رہے ہیں؟

اس نے سردی سے بچنے کے لئے اپنے جسم کو سکیڑ لیا اور بولا۔" تمہیں معلوم ہے اس کنویں کی تاریخ کیا ہے۔ یہ کنواں آج تک ختم کیوں نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی تاکہ وہ کچھ بتائے۔ اس نے بیوی کو اپنی طرف متوجہ پاکر کہا۔ اس شہر میں سب لوگ مل کر یہ کنواں بھرنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور جب ان کی جدوجہد کامیاب ہو جاتی ہے اور ان کے اندر حبس اور منافرت پھیلانے والا یہ کنواں بھرنے کا حوصلہ اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو پتہ نہیں وہ کیوں ایک دوسرے پر الزام تراشیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ایک ہی نظریے کے لوگ ایک دوسرے پر گند اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی انہیں لڑا دیتا ہے اور ان میں سے کوئی دوسرے کو اس کنویں

ہیں دھکا دینے کے لئے اسے پھر سے کھول دیتا ہے۔

وہ بولی۔" میرے خیال میں اب کی بار ایسا نہیں ہو گا۔ شہر کے لوگ سازشی لوگوں کو اپنی صفوں میں کبھی نہیں گھسنے دیں گے۔ اس لئے اب کی بار یہ کنواں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔"

اس نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔" تمہارا کیا خیال ہے، سب لوگ کل یہ کنواں بھرنے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔"

"کیوں نہیں، محلے کی دوسری عورتیں بھی گھر کی پرانی اور بے کار چیزیں اکٹھی کر رہی ہیں اور یہ بھی اچھا فیصلہ ہے۔ اب کی بار یہ کنواں شہر کے لوگوں کے گھروں کی سب پرانی اور بے کار چیزوں سے بھرا جائے گا۔ دیکھو میں نے بھی کتنی پرانی چیزیں اکٹھی کر لی ہیں۔ میں نے تمہارے پرانے چشمے کا فریم بھی ان میں ڈال دیا ہے۔"

دوسرے دن جب وہ دونوں میاں بیوی کنویں پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ کنواں بھرنے کے لئے وہاں جمع ہو چکے تھے اور ایک شخص تقریر کر رہا تھا۔

"آج ہم اس کنویں کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں گے۔ اس نے سارے شہر میں حبس پھیلا رکھا ہے۔ لوگوں میں منافرت پھیل رہی ہے۔ بہت سے لوگ اس کنویں میں گر کر اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ پہلے اس کنویں کو مٹی سے بھرا جاتا رہا۔ مگر اب کی بار ہم اسے اپنے گھروں کی پرانی اور بے کار چیزوں سے بھریں گے۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ شہر کے لوگوں نے آج سب پرندے کھلی فضا میں اڑا دیے ہیں اور سب پنجرے اس کنویں میں پھینکنے کے لئے لے آئے ہیں۔ آج ہم سب پرانی چیزیں، پرانا لباس، پرانے ٹیپ ریکارڈ، پرانے رنگوں کے ڈبے، پرانا فرنیچر اور پرانے کیلنڈر اس کنویں میں پھینک کر اس کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں گے تاکہ کوئی ہمیں ایک دوسرے سے لڑا نہ سکے۔ ایک ہی نظریے کے لوگ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں بند کر دیں۔ ہماری

سوچ ذاتی نہیں، اجتماعی ہو گی۔ ہم ذاتی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں کی جان کے دشمن نہیں بنیں گے جو ہمارے ساتھ جدوجہد میں شریک رہے ہیں۔ ہم شہر میں حبس نہیں پھیلنے دیں گے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ماضی میں بھی ہمارے آباؤ اجداد کو اس لئے دکھ سہنے پڑے کہ انہوں نے اپنے ہی لوگوں کو اس کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ اب کوئی کسی کو اس کنوئیں میں دھکا نہیں دے گا۔ بسم اللہ کیجئے! آگے بڑھیئے اور کنوئیں کو بھر دیجئے۔"

سب لوگ اپنے ساتھ لائی ہوئی چیزیں کنوئیں میں پھینکنے لگے۔ خوشی کے مارے ان کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ پرانی چیزیں دھڑا دھڑ کنوئیں میں گر رہی تھیں وہ سب سارا دن کنواں بھرتے رہے اور رات گئے جب کنواں پوری طرح بھر گیا تو انہوں نے دعا کی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کنواں بھر جانے کے بارے میں کہانی لکھ رہا تھا کہ اس کی بیوی نے آکر اسے خبر سنائی کہ رات کسی نے کنواں پھر سے کھول دیا ہے اور کسی نے اپنے ہم نظریہ شخص کو ہی کنوئیں میں دھکا دے دیا ہے۔
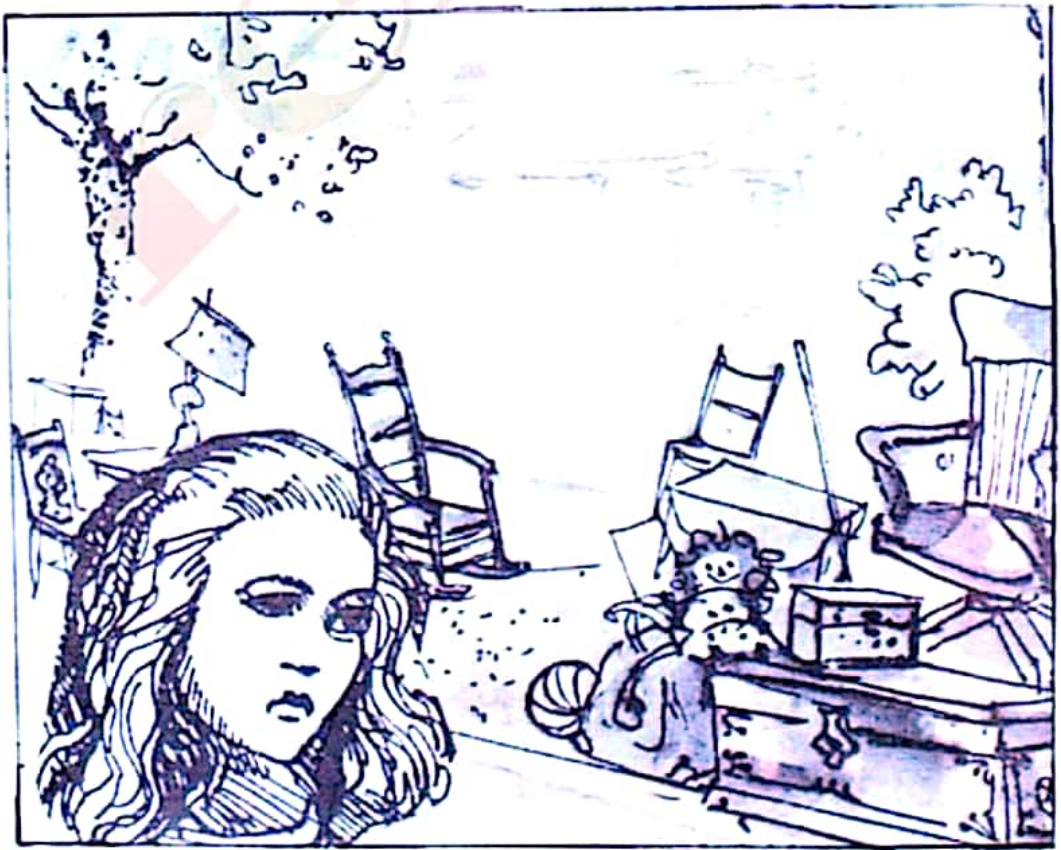
کھلونے ۔۲

ننھی کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا اس کی گڑیا امی کے بستر پہ لیٹی ہوئی تھی۔ اور مُنے کا پستول گڑیا کے پہلو میں پڑا تھا۔ ننھی نے ایک لمحے کے لئے غور سے دیکھا اور پھر چیخ مار کر باہر کی طرف بھاگی۔ ماں نے اسے گود میں اچک لیا اور جلدی سے پوچھا کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ لیکن ننھی بُری طرح سہمی ہوئی تھی اور اس کی چیخیں اس کی ماں کا دل نوچ رہی تھیں۔ وہ اسے کچن میں لے گئی۔ پانی پلایا اور ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔ جب ننھی کچھ سنبھل گئی تو ماں کے اصرار پہ اس نے صرف اتنا کہا۔ میری گڑیا۔ ماں اسے گود میں اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا ننھی کی گڑیا اس کے بستر پہ لیٹی تھی اور اس کے پہلو میں مُنے کا پستول پڑا تھا۔ ماں نے ننھی کو گود سے اتارا اور پستول اٹھانے کے لئے آگے بڑھی۔ لیکن پلنگ کے قریب جاکر رک گئی۔ ننھی کا سارا خوف اس کے اندر سرایت کر آیا۔ اس کی ہمت دم توڑ گئی۔ مُنے کا پستول بالکل گڑیا کے قریب پڑا تھا۔ اس نے سوچا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پستول اٹھانے لگے اور وہ چل جائے۔ اور گڑیا...... اسے بھی رونا آگیا۔ ننھی پھر رونے لگی اور یوں لگا جیسے ان دونوں کو روتے دیکھ کر گڑیا بھی رو پڑی ہے۔ ماں کو خیال آیا کہ ننھی نے کچھ دن پہلے اپنے باپ سے شکایت کی تھی کہ مُنا اپنا پستول ننھی کی گڑیا سے دور رکھا کرے، تو

باپ نے کہا تھا۔ منے کا پستول تو محض کھلونا ہے اور گڑیا کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ کھلونے تو اکھٹے پڑے رہتے ہیں۔ ریچھ، بندر، گڑیا اور گڈا ایک ہی ٹوکری میں ہوتے ہیں۔ مگر انہیں ایک دوسرے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ پھر ماں کو اپنے بچپن کا وہ دن یاد آگیا جب وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ دریا کے کنارے پکنک منانے گئی تھی۔ تو اس کی گڑیا دریا میں گر گئی تھی۔ تو اس نے بھی اپنی گڑیا کے پیچھے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کے چچا نے اسے دریا سے نکال لیا تھا، مگر اس کی گڑیا دریا میں ڈوب گئی تھی۔ پھر جب وہ جوان ہوئی اور ایک دن اپنے ساتھی کے ساتھ دریا کے کنارے گئی تو اس نے اپنی گڑیا کے دریا میں ڈوب جانے کا سارا قصہ اسے سنایا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ چھوڑو اب بھول جاؤ اس گڑیا کو۔ اس نے اپنے ساتھی کے کہنے پر اس گڑیا کو بھولنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اب تک جب بھی وہ اپنا لباس تبدیل کرتی ہے، اور بالوں میں کنگھی کرنے بیٹھتی ہے تو گڑیا آکر اس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس وقت بھی سامنے بستر پر وہی گڑیا لیٹی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں پستول پڑا تھا۔ وہ ایک بار پھر ڈوبنے لگی تھی۔ اور رحم طلب نظروں سے اسے اور ننھی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے منا گڑیا کو قتل کرنے کے بعد اپنا پستول وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ شاید ننھی کو بھی ایسے ہی لگا ہو۔ کیونکہ وہ پھر رونے لگی تھی۔ روتے روتے اس کے بال لمبے ہو گئے۔ گھنے ملائم اور چمکدار۔ اس کا قد ماں جتنا ہو گیا۔ وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑا اور جسم جوانی کی خوشبو سے لبالب بھر گیا۔ اس کا کزن منا بھی اپنے پرانے نام کو بھول چکا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ بھی کبھی ننھی تھی۔

اب وہ برآمدے میں بیٹھے ہیں۔

وہ پوچھتا ہے۔ تم ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہو؟

وہ چپ رہتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں۔ کچھ تو بولو۔

وہ کہتی ہے اگر میں نے کچھ کہا تو تم سن سکو گے؟

جو جی میں آتا ہے کہہ ڈالو۔

وہ پھر چپ ہو گئی۔

اس نے پھر اصرار کیا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"یاد ہے تم نے بچپن میں میری گڑیا کو قتل کر دیا تھا؛

اور اب

کئی دنوں سے مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہو۔

وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ پگلی کہیں کی، ہم تو کھلونے ہیں۔ یاد نہیں جب ہم چھوٹے تھے تو تمہارے ابا نے ایک بار کہا تھا۔ کھلونوں کو ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ ریچھ، بندر، گڑیا اور گڈا ایک ہی ٹوکری میں پڑے رہتے ہیں۔ اس کی بات سن کر وہ تیزی سے گھومی اور اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ ریچھ ہے، بندر یا گڈا؟

جنتری

بابا فرید گنج شکر کے میلے سے واپس آتے ہوئے وہ مجھے بس میں مل گیا، تو میں نے اسے اور اس نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ مجھے گاؤں چھوڑے دس سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مگر وہ ابھی تک گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ اپنی زمینوں میں ہل چلاتا تھا، فصلیں بوتا تھا۔ اپنے جانوروں کے لئے ٹوکے پر چارہ کترتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اب بھی ہر سال گنے کی فصل جوان ہونے پر وہ گڑ بناتا ہے اور جب بڑی بڑی کڑاہیوں میں گنے کا رس کھولنے لگتا ہے اور گڑ کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے تو رات رات بھر محفل جمی رہتی ہے۔ ڈنگروں کی بیماریوں، گاؤں کی نوجوان لڑکیوں، گڑ کی اقسام اور آنے والے موسموں کی فصلوں کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں۔ حاضر لوگ تازہ گڑ میں دیسی گھی ڈال کر اس سے روٹی کھاتے ہیں۔

میں نے بات بدلنے کے لئے اس سے پوچھا: "کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

اس کی آنکھوں میں یکدم اداسی چھا گئی۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا ہم دونوں نے سگریٹ سلگائے تو وہ ڈرائیور کے سامنے لگے شیشے میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے شادی نہیں کی۔"

اس کی بات سُن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ تو جولاہے کی بیٹی سے عشق کرتا تھا۔ میں دس سال پیچھے چلا گیا۔

اس دن وہ میرے ساتھ ہی ببول کے نیچے بیٹھا ہیر سن رہا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ہر سال ہیر کی محفل جمتی تھی اور ہیر پڑھنے والے دور دور سے آیا کرتے تھے۔ اس دن ہیر سُن کر وہ گھر آیا اور سوت لے کر جولاہے کے گھر کھیس بننے کے لئے دینے چلا گیا۔ اس نے خود ہی مجھے بتایا تھا کہ جب وہ جولاہے کے گھر پہنچا تو ایک "کھڈی" پر جولاہا اور دوسری پر اس کی بیٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سوت ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا کھیس بن دو۔ "مجنوں کھیس" "مجنوں کھیس" کا نام سن کر جولاہے کی بیٹی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، تو اسے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو، کہو تو تمہیں بھی بُن دوں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ واقعی کچا سُوت ہے۔

اتنے میں اس نے میرا کندھا ہلایا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے دس سال بعد ملا ہے، اس نے ابھی شادی بھی نہیں کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ خود ہی بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ وہ وعدے کی بڑی پکی تھی۔ اس نے نے مجھے بُننا شروع کر دیا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا ہیر سنی ہے کبھی تم نے، کہنے لگی ہاں میں نے ہیر سنی ہے۔ اللہ بخشے میرے چاچا جی بڑی اچھی ہیر پڑھتے تھے۔ میرے جی میں آیا کہ کاش اس کا چاچا زندہ ہوتا تو میں اس سے کہتا اپنے چاچا جی سے ایک بار پھر ہیر سُنو۔ لیکن میں صرف اس کے چاچے کا افسوس کر کے چپ ہو گیا۔

وہ مجھے بُنتی رہی...... بُنتی رہی..... اس دوران مکئی گندم، باجرے اور گنے کی کئی فصلیں کاشت ہوئیں۔ دل کی فصل بھی جوان ہو گئی۔

پھر اس دن میں مُنجی لگا رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔

"منجی کا موسم شروع ہوگیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہاں تمہیں نہیں پتہ؟"

کہنے لگی۔

"میں بھی تو ایک موسم ہوں۔"

عورت ایک موسم ہی ہوتی ہے۔ مگر دوسرے عام موسموں کی طرح اس کی تاریخ جنتری میں درج نہیں۔ اس موسم میں دل کی کونپل ہری ہوتی ہے اور کبھی کبھی مرد کو پتہ بھی نہیں چلتا اور یہ موسم آکر گزر بھی جاتا ہے۔ میں نے کہا۔ تم تو ایسے موسم کی طرح ہو جس میں دھوپ بھی نکلی ہوتی ہے اور بارش بھی ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو میں نے کہا مجھے تو تم جنتری کی طرح لگتی ہو۔ ایسی جنتری جس میں تاریخوں اور موسموں کے علاوہ میرا زائچہ بھی درج ہے۔

اس نے مجھے سُنتے سُنتے غور سے اپنے ہاتھ پر پھیلی ہوئی لکیروں کو دیکھا اور بولی۔

"اگر مکئی کی فصل کا موسم اور میرا موسم اکٹھا آگیا تو کیا کرو گے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری خوشبو مکئی کی خوشبو سے ملتی جلتی ہے۔ پھر بھی میں تمہیں الگ سے پہچان لوں گا۔"

وہ قدرے اداس ہوگئی۔

تب مجھے اس کی باتیں پار سال کے کپڑوں کی طرح تنگ ہونے لگیں۔ مگر وہ مجھے سُنتی رہی۔ گھر کی چھتی پہ جنتریوں کا ڈھیر لگ گیا اور پھر ایک دن جب میں جانوروں کو چارہ ڈال کر شام پڑے گھر لوٹ رہا تھا تو وہ مجھے مل گئی۔ اس دن اس کا چہرہ پکی ہوئی گندم کے خوشوں کی طرح سنہرا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ بس میری طرف دیکھتی رہی۔

اس دن مجھے لگا جیسے میں مکمل ہو گیا ہوں۔ اس نے مجھے بُن لیا ہے۔

یہاں تک بتا کر وہ چپ ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑا سگریٹ سلگانے کے لیے جلتی ہوئی تیلی اس کی طرف بڑھائی اور پوچھا۔ پھر کیا ہوا؛ اس نے سگریٹ سلگایا اور لمبی سانس لے کر بولا۔

ابھی میں نے اگلے سال کی جنتری بھی نہیں خریدی تھی کہ اس نے مجھے بن کر خود ہی ادھیڑ بھی دیا۔ اور اپنے چاچے کے بیٹے کے ساتھ چلی گئی۔

کھویا ہوا بچپن، ڈھونڈا ہوا بڑھاپا

کیا وہ اشتہار تم نے چھپوایا تھا؟

کون سا اشتہار

وہی اشتہار۔ اعلانِ گمشدگی

کونسا اعلان کونسا اشتہار

میری گمشدگی کے بارے میں

نہیں، میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں کہ تم کون ہو

میں وہی ہوں جس کے بارے میں تم نے اعلان کروایا تھا کہ ایک بچہ جس کی عمر دس سال ہے۔ اس نے گھر سے براؤن رنگ کی خانے دار بشرٹ اور خاکی رنگ کی نیکر پہن رکھی ہے۔ کل صبح کھیلنے کے لیے گھر سے نکلا تھا مگر پھر لوٹ کر نہیں آیا۔

وہ یکدم گھبرا گئی اور غور سے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔ نہیں میں نے ایسا اعلان نہیں کروایا نہ ہی میں تمہیں جانتی ہوں اور اب تم جوانی کی دہلیز عبور کر چکے ہو۔ کیا یہ تمہارے بچپن کا واقعہ ہے کیا تم گم ہو گئے تھے۔

وہ اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سگریٹ کا لمبا کش بھرتے ہوئے بولا۔

ہاں میں بچپن میں گم ہو گیا تھا اور آج تمہیں دیکھ کر نجانے مجھے کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ میری گمشدگی کے بارے میں وہ اعلان تم نے ہی کروایا تھا اور آج تمہیں دیکھتے ہی مجھے لگا جیسے میں جو گم ہو گیا تھا اب مل گیا ہوں۔ بچپن سے اب تک میں بھی اپنے آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں مگر تمہیں مل کر آج جیسے مجھے قرار سا آ گیا ہے۔ لگتا ہے میں نے اپنے آپ کو ڈھونڈ لیا ہے۔ مگر اب مجھے گم نہ ہونے دینا۔ آج میری کیفیت اس بچے کی سی ہے جو پہلی بار چڑیا گھر دیکھنے جاتا ہے اور ہر جانور کو دیکھنے کے بعد بار بار کسی بڑے کی انگلی پکڑ لیتا ہے میری بھی اس وقت یہی کیفیت ہے میں اندر سے ڈر رہا ہوں کہ کہیں پھر گم نہ ہو جاؤں۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔

اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو اس کی کیفیت اس بچی جیسی ہو گئی جسے سکول کے برآمدے میں بھاگتے بھاگتے اچانک احساس ہوتا ہے کہ اس کا ربن بالوں سے نکل کر کہیں پیچھے گر گیا ہے۔ وہ بار بار اپنے خوبصورت بالوں میں ربن کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھر کچھ دیر بعد وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور بولی۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ کیا بچپن میں تم کہیں میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔

نہیں مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم بچپن میں کہاں رہتی تھی۔

تو پھر تم یہ سب کچھ کیوں کہہ رہے ہو۔

اس لیے کہ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم مجھے ڈھونڈتی رہی ہو اور اب تک اپنے بچوں میں بھی مجھے ڈھونڈتی رہتی ہو۔

وہ یکدم پیچھے کی طرف ہٹی اور بولی۔ تم میرے بارے میں کیسے جانتے ہو۔

میں تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔

کیا؟

یہ کہ ایک بار سکول میں تمہارا بستہ گم ہو گیا تھا اور اس بستے میں کہانیوں کی ایک کتاب بھی تھی جس میں سنہری بالوں والی لڑکی کی کہانی تمہیں بہت پسند تھی۔ تمہارے والدین نے کورس کی کتابیں تمہیں پھر سے خرید دی تھیں مگر کہانیوں کی وہ کتاب کوشش کے باوجود کہیں سے بھی نہیں مل سکی تھی۔ پھر جب تمہارے سکول میں ڈرامہ سٹیج کیا گیا تھا تو تم نے سنہری بالوں والی اس لڑکی کا کردار ادا کیا تھا جس کی کہانی، کہانیوں کی اس کتاب میں تھی جو گم ہو گئی تھی۔

وہ یک دم بہت اداس ہو گئی اور بولی۔ یہ تو کئی سال پرانی بات ہے اس کے بعد میں نے کئی کہانیاں پڑھی ہیں اور کئی کہانیاں اپنے بچوں کو بھی سنائی ہیں۔

لیکن اب بھی جب تم بچوں کو کہانی سناتی ہو تو کہانی سناتے سناتے اچانک رک جاتی ہو اور تمہیں سنہری بالوں والی وہی لڑکی یاد آ جاتی ہے۔

تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟

میں جانتا ہوں کہ پھر تم کتنی دیر ماضی میں بھٹکتی رہتی ہو۔ حتیٰ کہ تمہارے بچے تمہیں جھنجھوڑ کر پوچھتے ہیں امی پھر کیا ہوا۔ تم چونک اٹھتی ہو اور کہانی کو وہیں سے شروع کرنے کی کوشش کرتی ہو جہاں سے اس کا سلسلہ ٹوٹا تھا مگر تمہیں کہانی کا سرا نہیں ملتا اور تم گھبرا کر اپنے بچوں سے کہتی ہو بس اب سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔

وہ غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی، مگر جب وہ چپ ہو گیا تو بولی میں حیران ہوں کہ تم کبھی مجھ سے نہیں ملے اور پھر بھی میرے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو۔ وہ باتیں جو میرے شوہر اور بچوں کو بھی معلوم نہیں — کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ — وہ چپ ہو گئی۔

ہاں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم بچپن میں گم ہو گئی تھیں اور تمہارے بارے میں اعلان بھی ہوا تھا۔

ایک بچی جس کی عمر دس سال ہے اس نے گہرے براؤن رنگ کا فراک پہن رکھا ہے اور پاؤں سے ننگی ہے اس کے پاس اس کی گڑیا بھی ہے کل صبح کھیلنے کے لیے گھر سے نکلی تھی مگر

لوٹ کر نہیں آئی۔

اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور کھول دیں۔ یک دم ۳۹ سال اس کی مٹھیوں سے پھسل کر گر گرے۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر شروع بہار کے موسم میں نئے نئے کھلے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھا اور بولی۔

مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آج میں نے بھی اپنے آپ کو ڈھونڈ لیا ہے

ڈیڈ لیٹر

اس دن صبح کی ڈاک سے شہر کے پوسٹ ماسٹر کو ایک خط موصول ہوا۔

جناب پوسٹ ماسٹر صاحب!

سلام مسنون

میں ایک قیدی ہوں اور شہر کی جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہوں آپ کے بارے میں
میں نے سنا ہے کہ آپ ایک ہمدرد اور مشفق انسان ہیں
اور دکھ درد میں ہمیشہ دوسروں کے کام آتے ہیں جب سے آپ شہر کے ڈاک خانے کے انچارج بن کر
آئے ہیں ڈاک کا نظام اس قدر اچھا ہے کہ جیل کے قیدی بھی اس کی تعریف کرتے ہیں آپ کو یہ تو
معلوم ہی ہوگا کہ ہماری طرح کے قیدیوں کے لیے خط لکھنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے پاس کاغذ
قلم بھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی آپ کو کسی نہ کسی طرح یہ خط لکھ رہا ہوں کیوں کہ میرا اس دنیا میں
کوئی نہیں تھا تو اکثر ڈاک خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر آپ پر ضرور پڑتی تھی مگر
آپ نے شاید مجھے کبھی نہ دیکھا ہوگا کیونکہ آپ ہر وقت کام میں مصروف ہوتے تھے اب بھی آپ
کا چہرہ اور کھلی کھلی روشن آنکھیں اس جیل کی کوٹھری میں بھی ہر وقت میرے سامنے رہتی ہیں اور مجھے وہ
چڑیا بھی بہت یاد آتی ہے جو اکثر ڈاک خانے کے برآمدے کے ستون کے ساتھ بندھے ہوئے لیٹر بکس
پر بیٹھی رہتی تھی یہ جیل کی زندگی بھی عجیب زندگی ہے جیل سے باہر گزری ہوئی زندگی کا پل پل یاد آتا
ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اگر ہو سکے تو مجھے کچھ ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیں تاکہ آپ جیسے لوگوں
کو خط لکھ سکوں ایک قیدی کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ اسے اس کے خط کا

جواب لکھیں ایک اور درخواست بھی کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ میرے لیے دعا کریں کہ خدا مجھے اس جیل سے نجات دے۔

فقط ایک قیدی

نمبر....

سٹی سنٹرل جیل

پوسٹ ماسٹر نے خط پڑھ کر اپنے ساتھی سے کہا میری ساری عمر ڈاک خانوں میں گزری ہے میں نے ایک ڈاکیے کے گھر میں آنکھ کھولی میں نے ہمیشہ اپنے اردگرد خط ہی خط دیکھے بلکہ جب میرے گاؤں کے کچھ جوان جنگی قیدی ہو گئے تھے تو ان کی طرف سے آنے والے خط بھی ان کی ماؤں، بہنوں اور بیویوں کو میں ہی پڑھ کر سنایا کرتا تھا جب میرا بھائی بحری جہاز پر ہونے والے ایک جھگڑے میں قتل ہو گیا اور اس کی لاش تابوت میں بند کرکے بھیجتے وقت جو خط ہمیں لکھا گیا تھا وہ بھی سب سے پہلے میں نے پڑھا تھا مگر آج یہ خط پڑھ کر مجھے یوں احساس ہوا ہے کہ یہ میری زندگی کا یادگار خط ہے معلوم نہیں اس نے یہ خط کس مشکل سے لکھا ہے میں آج ہی اسے خط کا جواب لکھوں گا اور بہت سارے ڈاک ٹکٹ بھی بھیجوں گا۔ اس بات کو ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک سکول ماسٹر کو بھی کسی قیدی کا ایک خط موصول ہوا۔

محترم ماسٹر صاحب!

آپ کو شاید یاد نہ ہو مگر جب میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا تو آپ ہمیں تاریخ پڑھایا کرتے تھے اور آپ نے ہمیں پاکستان کی تاریخ اتنی اچھی طرح پڑھائی تھی کہ ہمارے دلوں میں اپنے ملک کے لیے محبت کا جذبہ بیدار ہوا آپ ہی کی وجہ سے میں نے تاریخ کے پرچے میں فسٹ ڈویژن حاصل کی آپ ہی کی وجہ سے مجھے تاریخ کے مضمون میں دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے تاریخ میں ایم اے کیا مگر پھر کیا ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے بس اتنا بتا دینا کافی ہے کہ آج کل میں ایک قیدی ہوں اور اپنے شہر کی جیل میں قید کی سزا کاٹ رہا ہوں میرے دو بچے بھی ہیں جن میں سے ایک ابھی بہت چھوٹا ہے۔

اور اس کی سکول جانے کی عمر نہیں ۔ لیکن دوسرا اب سکول جانے والا ہے مگر اسے داخلہ نہیں مل رہا میری بیوی بھی اس وجہ سے بہت پریشان ہے میں ایک قیدی ہوں اور میری خواہش ہے کہ میری طرح میرے بچے بھی تعلیم حاصل کریں اس لیے آپ مہربانی فرما کر میرے بچے کو سکول میں داخلہ دلوا دیں میں اور میری بیوی آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے اس کے علاوہ آپ سے ایک درخواست اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پاکستان کی تاریخ کے موضوع پر کوئی نئی کتاب چھپی ہو تو مہربانی فرما کر وہ بھی مجھے بھجوا دیں اگرچہ اب میرا تاریخ کے مضمون کی طرف سے دل دکھ گیا ہے ۔ لیکن پھر بھی میرے لیے دعا بھی کریں ۔

آپ کا پرانا شاگرد

ایک قیدی

سنٹرل جیل

انہی دنوں ایک ادیب کو بھی ایک قیدی کی طرف سے ایک خط موصول ہوا ۔

محترم جناب !

میں یہ خط آپ کو جیل سے لکھ رہا ہوں آپ کا پتہ بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے میں ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی ہوں اور میں نے بلھے شاہؒ ، سلطان باہوؒ اور بابا فریدؒ کا کلام پڑھا ہے ۔ اس کے علاوہ میں ملک کے ادیبوں کی کتابیں بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں ۔ مجھے احساس ہے کہ میں ایک قیدی ہوں اور آپ کو بھی معلوم ہے کہ ایک قیدی کی کیفیت کیا ہوتی ہے آپ بڑی سچی باتیں لکھتے ہیں ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی ساری کتابیں پڑھوں ۔ مگر میں آپ کی کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اگر آپ اپنی کتابیں بھجوا سکیں تو ایک قیدی پر آپ کا یہ احسان ہوگا ۔ میرے لیے بھی دعا کریں شاید خدا آپ کی ہی سن لے ۔

ایک قیدی

سنٹرل جیل

کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب کو بھی کسی قیدی کا ایک خط موصول ہوا۔

محترم جناب ڈاکٹر صاحب

میں یہ خط اس لیے آپ کو لکھ رہا ہوں کہ کچھ دنوں سے مجھے سانس کی تکلیف نے نڈھال کر رکھا ہے۔ آپ ایسی بیماریوں کے ماہر ہیں اس لیے کوئی ایسی دوا تجویز کریں کہ میں اس بیماری سے نجات حاصل کر سکوں۔ میں ایک قیدی ہوں اور آپ کے شہر کی بڑی جیل میں سزا کاٹ رہا ہوں۔ میرا قصور کیا تھا اور مجھے یہ قید کیوں بولی یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ جیل کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ یہاں ہمارے خوابوں میں بے بسی کا جھاڑ جھنکار اگتا ہے۔ میں تو اب یہاں موسموں کی ترتیب بھی بھول گیا ہوں۔ مہربانی فرما کر مجھے سانس کی تکلیف کی دوا تجویز کریں اور ہو سکے تو کسی ملاقاتی کے ہاتھ دوا بھی بھیج دیں۔

پھر ایک دن کسی قیدی نے مجھے بھی ایک خط لکھا تب پتہ چلا کہ یہ اس شہر کی بات ہے جس شہر کے لوگوں کو نیند میں چلنے کی بیماری لگ گئی تھی۔ ان کی آنکھیں سیلن زدہ گھروں کی طرح ہو گئی تھیں ان کے کان بوسیدہ دروازوں کے قبضے کی طرح زنگ پکڑ چکے تھے اور وہ ایک دوسرے کو خط لکھ رہے تھے۔
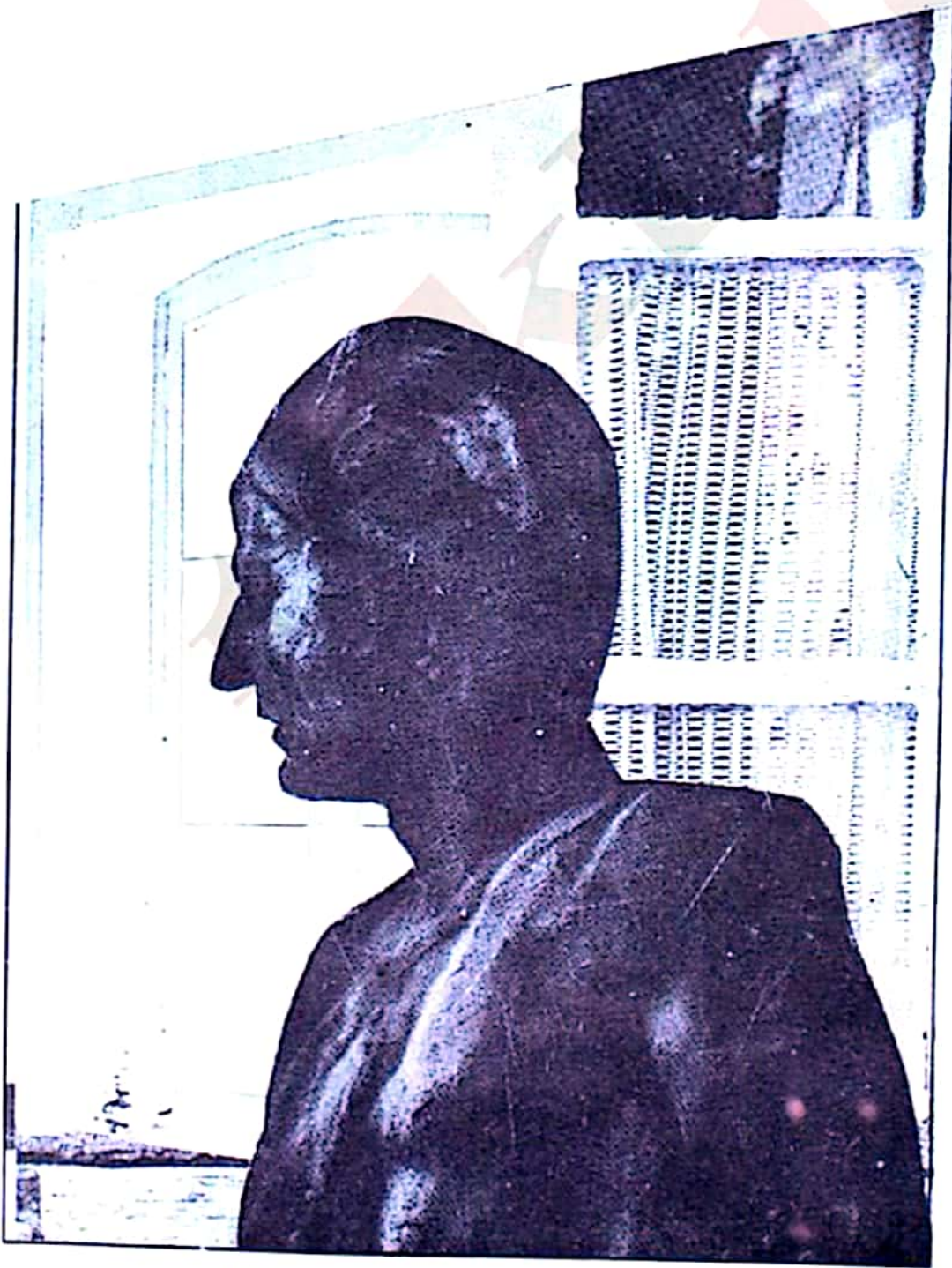
شیلف سے گری ہوئی کتاب

آج سے دس بارہ سال پہلے جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے لگا جیسے کوئی بہت پرانی کتاب شیلف سے گر کر اچانک میرے سامنے کھل گئی ہے۔ اس کے چہرے پر نایاب اور آؤٹ آف پرنٹ کتابوں جیسی متانت اور سنجیدگی تھی۔ مجھے اس نے بے حد متاثر کیا۔ جب وہ میز پر چائے کے برتن رکھ رہا تھا تو میں نے اس سے پوچھا۔ بابا کتنے عرصے سے اس ریستوران میں کام کرتے ہو۔ کچھ دیر تک چُپ رہنے کے بعد، جب اس نے دیکھا کہ اپنی آنکھ پہ ٹکے ہوئے سوال کو، میں نے ابھی ہٹایا نہیں، تو وہ بولا۔

"مجھے یہاں کام کرتے ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں۔ جب میں اس ریستوران میں آیا تھا تو اسے بنے ہوئے دو سال ہوتے تھے۔ اس سے پہلے میں ایک انگریز کے ہاں ملازم تھا۔"

"وہاں کیا کام کرتے تھے؟"

"یہی، لیکن وہاں میں کھانا بھی پکایا کرتا تھا۔ مگر پھر وہ انگریز واپس اپنے وطن چلا گیا تو میں اس ریستوران میں آ گیا۔"

میں نے اس سے کچھ اور سوال بھی کئے۔ مگر مجھے لگا کہ شیلف سے گری ہوئی کتاب جو اچانک میرے سامنے کھل گئی تھی، اس پہ بہت دھول جمی ہوئی ہے۔ جسے جھاڑنے

میں بہت وقت لگے گا۔

اگلے سال میں پھر اس پر فضا پہاڑی مقام پر گیا تو چائے پینے کے لئے اسی ریستوران میں چلا آیا۔ یہاں وہ بیرا ہے اور اتفاق سے جس ٹیبل پر میں بیٹھا، وہ اس دن کسی اور بیرے کے ذمے تھی۔ جب وہ بیرا چائے لایا تو میں نے پوچھا۔

"آپ کے ہاں ایک بابا جی بھی ہیں۔ لیکن ابھی میں بابا کا حلیہ بیان کرنے ہی والا تھا کہ اس نے جھٹ سے کہا۔ "آپ رحمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں نا؛ ٹھہریں میں ابھی اسے بلاتا ہوں۔" وہ اندر گیا اور بابا کو بلا لایا۔ چونکہ مجھے اس کا نام معلوم ہو چکا تھا اس لئے میں نے اسے رحمت بابا کہہ کر مخاطب کیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور میری خیریت پوچھی۔ اس کے چہرے پر وہی سنجیدگی اور متانت تھی اور اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ اس ہوٹل میں بیرا ہے تو میں اسے کوئی ریٹائرڈ افسر سمجھتا۔ گہری سوچتی ہوئی آنکھیں، بھاری سفید مونچھیں اور چہرے پر پھیلی ہوئی سلوٹیں، اس کی شخصیت کے رعب میں اضافہ کر رہی تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ بابا رحمت بہت کم بولتا ہے۔ پھر مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ چونکہ ریستوران میں رش زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ کسی گاہک کے ساتھ گپ شپ میں وقت ضائع کرے۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جگہ کی کمی کے باعث میری میز کے دوسری طرف پڑی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اور بولا، چاچا چائے لاؤ۔ بابا رحمت کے چہرے پر ایک پرانی اور بوسیدہ سی مسکراہٹ ابھری تو مجھے یوں لگا جیسے وہ ادھیڑ عمر شخص چاچا رحمت کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ میں نے بات شروع کرنے کے لئے اس سے پوچھا۔

"آپ یہیں رہتے ہیں یا سیر کی غرض سے اس پہاڑی مقام پر آئے ہوئے ہیں؛ اس شخص کے چہرے پر اپنائیت کی چمک ابھری۔" میں محکمہ ڈاک میں ملازم ہوں اور

کئی سال سے یہیں تعینات ہوں۔"

اس کی یہ بات سن کر میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اتنے میں بابا رحمت اس کے لئے چائے لے آیا۔ وہ برتن رکھ کر پلٹا ہی تھا کہ میں نے اس شخص سے کہا۔

"بابا رحمت بڑا دلچسپ آدمی ہے۔"

"او جی اس کی بھلی پوچھی۔ ایسا منظم آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ اس بات سے ہی اندازہ لگا لیں کہ اس ریستوران میں کام کرتے ہوئے اسے پچاس سال ہو گئے ہیں، ہر کام وقت پہ کرتا ہے۔ اصل مالک کے پوتے اب اس ریستوران کو چلا رہے ہیں مگر اس سے آج تک کسی کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اس علاقے کی ساری تاریخ اسے زبانی یاد ہے۔ اس علاقے کے سب لوگ چاچا رحمت کی بہت عزت کرتے ہیں۔

اس نے پیالی میں قہوہ ڈالنے کے لئے چینک اٹھائی تو میں نے اس سے پوچھا: "بابا رحمت کے بیوی بچے نہیں ہیں؟" قہوہ پیالی میں ڈال کر اس نے چینک پھر میز پہ رکھ دی اور چینی دان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ نہیں..... چاچا رحمت نے شادی نہیں کی۔ اس کا کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں، اس کا کوئی گھر بھی نہیں۔ رات پڑتی ہے تو یہیں فرش پہ بستر بچھا کے سو جاتا ہے۔" پھر وہ بھی کچھ اداس سا ہو گیا۔ اور کہنے لگا: "چاچا مجھ سے ناراض ہے۔" "وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "ایک دن چاچا نے مجھ سے ایک خط پہ پتہ لکھوایا تھا۔ مگر پھر کچھ عرصے کے بعد چاچا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ تم نے پتہ غلط لکھ دیا تھا۔ اس بات کو کئی سال ہو چکے ہیں۔ میں اکثر چاچا سے کہتا ہوں کہ پھر خط لکھوا لو اور صحیح پتہ بتا دو۔ مگر چاچا نہیں مانتا۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چاچا واقعی ایسی کتاب ہے جو کئی سال پہلے شیلف سے کوئی دوسری کتاب نکالتے ہوئے نیچے گر گئی تھی۔ مگر اسے کسی نے اٹھا کر دوبارہ شیلف میں نہیں رکھا۔

اچانک سامنے بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص کی آواز نے میری سوچ کا سلسلہ کاٹ دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے بھی اب وہ پتہ یاد نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسا ہو گا، ورنہ میں پتہ ذہن نشین کر لیتا۔ اب آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں کس قدر ذہنی کرب میں مبتلا ہوں۔ میرے بار بار پوچھنے کے باوجود چاچا یہی کہتا ہے: "چھوڑو اب، رہنے دو۔"

ابھی وہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ بابا ہماری میز کے قریب آیا اور چائے کے خالی برتن ٹرے میں رکھنے لگا۔ میں نے غیر ارادی طور پر کہا۔ "بابا وہ خط پھر لکھوا لو، اب یہ پتہ ٹھیک لکھیں گے۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔"

بابا نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "نہیں جی مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں۔ میں نے شہر میں جب بھی کسی سے خط پر پتہ لکھوایا اس نے غلط لکھ دیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ سارے شہر کو میرا پتہ ہی لکھنا نہیں آتا۔"

میں نے غور سے بابا کی طرف دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے بابا چلڈرن پارک میں لگا ہوا وہ بورڈ ہے جس پر پتھر مار مار کر بچوں نے سب لفظ اڑا دیئے ہوں اور اب کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس پر کیا لکھا تھا۔
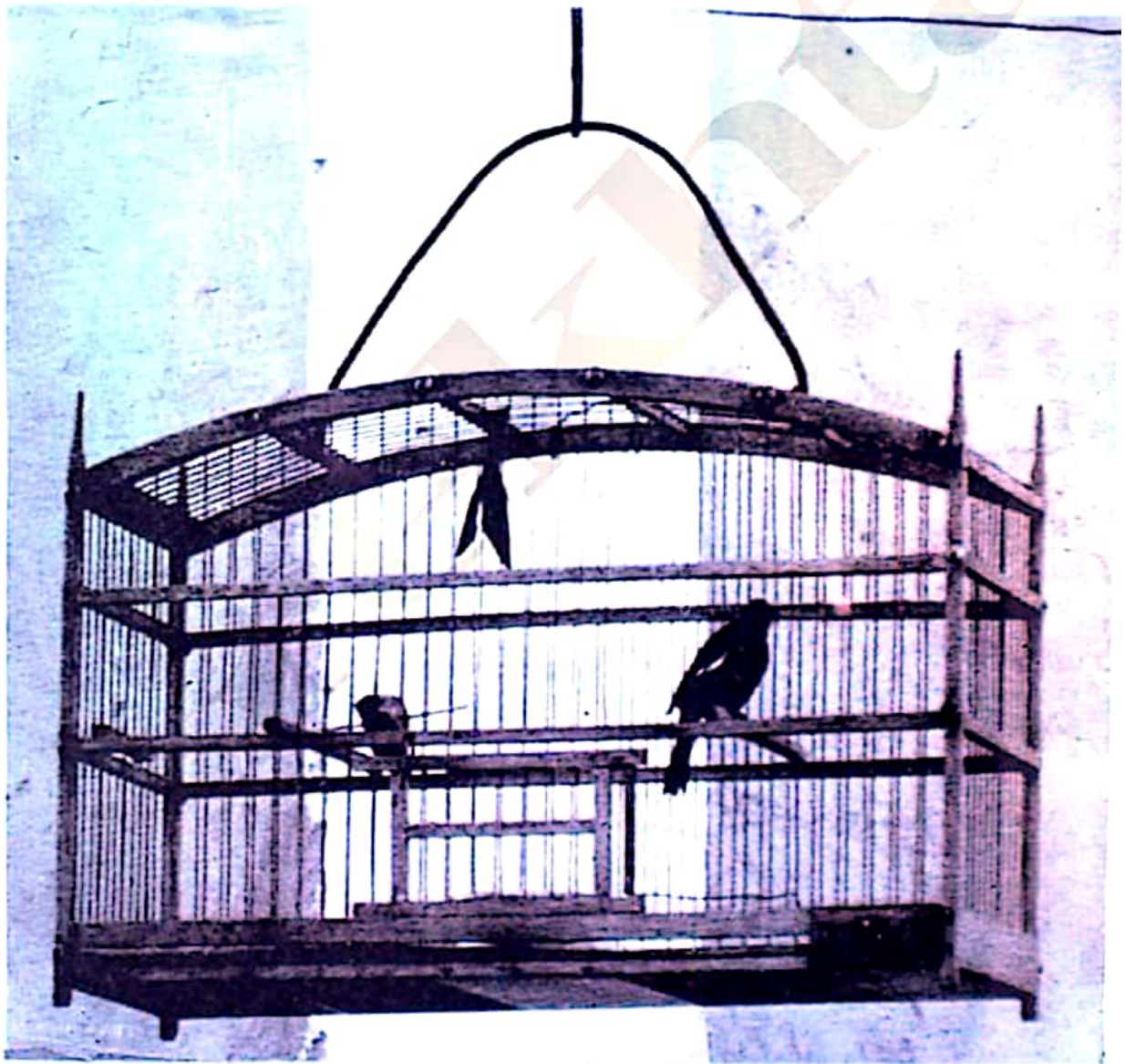
کہار

اس دن جب ریل گاڑی ایک چھوٹے سے گاؤں کے ریلوے اسٹیشن پر رکی تو وہ گاڑی میں سوار ہوا۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ ہم کتنی دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں دوڑتے رہے۔ مگر وہ بہت جلد تھک گیا۔ اور نظریں پھیر کر سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے سینے سے چمٹایا ہوا تھیلا گود میں رکھ لیا۔

تب میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ شیدا تھا اور آج میں نے اسے بیس سال بعد دیکھا تھا۔ جب بیس سال پہلے میں نے ملازمت کی غرض سے اپنا گاؤں چھوڑا تھا، تو شیدا بالکل جوان تھا اور علاقے کے سب لوگ اس کی بہادری کے قائل ہی نہیں بلکہ اس سے دہشت زدہ بھی تھے۔

جن دنوں میں اپنا گاؤں چھوڑ رہا تھا، تو شیدے کی اپنی ماسی کی بیٹی سے محبت کے قصے گاؤں کے لوگوں نے اپنی باتوں میں یوں لپیٹ رکھے تھے، جیسے بعض بزرگ اپنی ڈبی میں تمباکو اور گڑ رکھتے ہیں۔

میں نے ایک بار پھر شیدے کی طرف دیکھا۔ مگر وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کا مضبوط جسم اب ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور پگڑی کے بل ڈھیلے ہو رہے تھے۔

میں نے آہستگی سے کہا۔ " شیدے "
اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد مجھے پہچان لیا اور بولا۔

"اوئے تم ..... کیا حال ہے؟"
پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ بیس سال پہلے کی باتوں سے لسی، گنے کے رس اور جدائی کی مہک آنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ رانی کا کیا حال ہے؟
شیدے نے گود میں رکھے ہوئے تھیلے پہ اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔
پرانی بات ہے لیکن مجھے کل ہی کی لگتی ہے۔ اس دن وہ اس طرح سجی ہوئی تھی۔ جس طرح کچھ ہی دن پہلے اس نے اپنی گڑیا کو سجایا تھا تو آپا نے پرانے ٹین سے گڑیا کی "پیسی" نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا تھا "اے بچڑا اب تو تیرے اپنے بیاہ کا وقت ہے۔
اور تو ابھی اپنی گڑیا کا بیاہ رچا رہی ہے۔ انہی دنوں اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں اس کے ماموں سے چھپ چھپ کر باتیں کرتی ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی ماں ماموں سے ہونے والی گفتگو گھر کے کسی اور "جی" سے نہیں بلکہ صرف اس سے چھپانے لگی ہے۔ بالکل جیسے وہ چھوٹی سی تھی تو اس کی ماں اس سے مصری چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا، چل یہ اچھی بات ہے۔ تیرے فائدے کی بات ہے .... وہ ہنس پڑی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اسے تو پہلے ہی معلوم ہے کہ یہ اس کے فائدے کی بات ہے بلکہ وہ تو مجھے بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ اس کے ہی نہیں میرے فائدے کی بات بھی ہے۔ اس دن وہ واقعی بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی گڑیا کو دلہن بنایا۔ اسے گوٹے والے کپڑے پہنائے، میٹھے چاول پکائے اور سہیلیوں کے ساتھ مل کر گیت گائے۔ درد وچھوڑے کے گیت ..... گوٹے کناری کے گیت ..... وعدہ نبھانے کے گیت ..... وہ گیت تم نے سنے ہوتے تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ ان گیتوں میں کیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ شیدے کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں. آنسو تریل کے قطروں کی طرح اس کی شفاف آنکھوں پہ چمک اٹھے تھے.

وہ چپ ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھا." پھر کیا ہوا؟"

" پھر کیا ہونا تھا؟ ایک دن اپنی گڑیا کی طرح وہ بھی دلہن بنی. میرے لئے نہیں کسی اور کے لئے. اس کی ماں نے اس کا کہیں اور رشتہ جوڑ دیا.

جب وہ مجھے ملی تو اس کی جھولی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی. اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس کی گڑیا کا خیال رکھوں گا.

میں نے رانی کی بات مان لی اور اس کی گڑیا کو چادر میں لپیٹ کر اپنے ساتھ لے آیا. برات آئی. پھول سجے.

جب بارات رخصت ہوئی تو اُس کی ماں نے مجھے کندھے سے پکڑ کر بلایا اور بولی ـ شیدے میری رانی کی ڈولی کو کندھا دو ــــــــ میرا اور اُس کا رشتہ ایسا نہیں تھا کہ میں اس کی ڈولی کو کندھا دیتا مگر جانے کیوں میں نے رانی کی ڈولی کو کندھوں پہ اُٹھالیا مجھے لگا جیسے ڈولی ان بیاہی گڑیوں سے بھری ہوئی ہے.

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ چپ ہو گیا. مگر کچھ دیر بعد اس نے چادر ہٹا کر قمیض کے بٹن کھولے اور کندھے پہ سے قمیض ہٹا کر مجھے اپنا کندھا دکھاتے ہوئے بولا." دیکھو یہ نشان."

میں نے دیکھا اس کے کندھے پہ ڈولی کے بانس کا گہرا نشان تھا.

اس نے گود میں رکھا ہوا تھیلا کھولا اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک گڑیا نکالی.

" یہ دیکھو اس کی گڑیا. میں نے بیس سال تک اس کا خیال رکھا ہے. مگر اب یہ اس کے بغیر بہت اداس ہو گئی ہے اور میں اسے اس سے ملوانے لے جا رہا ہوں."

وہ بہت زیادہ اداس ہو گیا تھا.

میں نے بات بدلنے کے لئے پوچھا۔ "شیدے دائی بیجی کا کیا حال ہے"
تو لمبی آہ بھر کر بولا۔
"سب چھوڑ دیا ہے۔ اب میں گاؤں کی ہر لڑکی کی ڈولی کو کندھا دیتا ہوں..... اور
گاؤں کے لوگ مجھے شیدے کہار کے نام سے جانتے ہیں۔

مرحوم کی رُوح اب کیا لینے آتی ہے؟

اس کے قریبی لوگوں کے حلقے میں اوپر تلے تین چار موتیں ہوئیں۔ مگر موت کی خبر سُن کر اس نے کبھی بھی عام لوگوں کی طرح کا تاثر نہیں دیا۔ نہ ہی وہ زیادہ اداس ہُوا اور نہ ہی خوفزدہ۔ بلکہ وہ موت کی خبر دینے والے کی طرف یوں دیکھتا جیسے لمبے روٹ پر چلنے والی بس کا کوئی تھکا ہارا مسافر کسی دوسرے سفر کی مار کھاتے ہوئے مسافر کی طرف دیکھتا ہے۔ دور پار کے دو رشتے داروں اور محلے ہی میں ایک نوجوان موت کے بعد اس کی چچی اور پھر ماموں کے فوت ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے بڑے اطمینان سے یہ خبر سُنی۔ اس کی بیوی نے شکایت بھرے لہجہ میں پوچھا: "موت کی خبر سن کر آپ کو افسوس کیوں نہیں ہوتا، آپ کو خوف کیوں نہیں آتا؟" بیوی کی بات سن کر وہ اسے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ دیکھو کچھ مسافر صبح کی گاڑی سے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ کچھ دوپہر کو گھر سے نکلتے ہیں تو کچھ شام کے وقت اپنا سامان باندھتے ہیں۔ اس میں حیرت، پریشانی یا خوف کی کون سی بات ہے؟

یہ بات اس کی بیوی نے اس کی موت کے چند روز بعد اس وقت لوگوں کو بتائی جب ابھی پھوڑی بچھی ہوئی تھی اور لوگ اس سے افسوس کرنے آئے تھے۔ اس کی بیوی بہت زیادہ غمزدہ لگ رہی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں خالی خالی ہو گئی تھیں۔ بات کرتے

کرتے اس کی آواز بیٹھ جاتی مگر وہ اپنے آپ پر قابو پالیتی اور پھر اس کی باتیں کرنے لگتی۔" اسے موت سے محبت ہو گئی تھی۔ اس نے موت کو اپنے اندر یوں پال لیا تھا جیسے کوئی بچہ اپنے دل میں کسی خوب صورت کھلونے کی خواہش پال لیتا ہے۔ یا جب کسی لڑکی کے بیاہ کی تاریخ پکی ہو جاتی ہے تو وہ بے تابی سے سرخ جوڑے اور مہندی کے دن گننے لگتی ہے۔ اس کی بیوی کی آواز ڈوب گئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

کچھ دیر تک سب لوگ گہری خاموشی اور دکھ میں ڈوبے رہے۔ پھر اس کی بیوی نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور اپنی آواز کو سہارا دیتے ہوئے بولی: "اسے موت کا شوق لگ گیا تھا۔ بالکل جیسے اسے کبوتر پالنے اور گھوڑوں کا شوق تھا۔ موت، گھوڑا اور کبوتر تینوں شوق اسے اتنے گہرے لگے کہ وہ ان سے ہٹا نہیں۔ ان کا دھیان کسی اور طرف نہیں گیا۔" اس کی بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور روتے روتے بولی۔ اس کے بغیر یہ زندگی کس کام کی؟ کچھ دیر تک سب لوگ پھر چپ رہے۔ اس کی بیوی ایک بار پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی: "موت کی اس نے یوں تیاری کی جیسے کسی دوسرے ملک کے سفر پر روانہ ہونے والا تیاری کرتا ہے۔ اس نے اپنی ڈائری، کاغذات اور کچھ دوسری چیزیں میرے حوالے کیں۔ کچھ ضروری چیزوں اور بے کار چابیوں کے بارے میں بتایا کہ وہ کہاں پڑی ہیں اور کہا کہ دیکھو چاچی کی میت کے قریب کچھ بچے کھیلنے لگ گئے تھے تو سب نے انہیں منع کیا تھا۔ مگر میری میت کے قریب بچوں کو کھیلنے سے منع نہ کرنا بلکہ اس دن کسی کو ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر پر گانے سننے سے بھی نہ روکنا۔ اچھا اور صاف ستھرا لباس پہننا۔ اور بچوں کا لباس بھی گندا نہ ہونے دینا۔ میں نے زندگی میں بہت سی اداسی اور ماتم دیکھا ہے اس لیے میری موت کے بعد زیادہ اداسی اور ماتم نہ ہونے دینا۔ شہر کے کچھ لوگ تم سے میری موت پر تعزیت کے لیے

آئیں گے۔ ان سے ملاقات کیے بغیر ان کی تعزیت وصول کر لینا حالانکہ وہ ایسا ہی چاہتے ہیں اور میری موت پر انہیں بے حد خوشی ہو گی۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جو ایک مدت سے میری موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ میرے کسی عزیز، دوست یا رشتہ دار سے اس طرح پریشان اور اداس ہو کر نہ ملنا کہ اسے کہنا پڑے کہ وہ تمہارے غم میں برابر کا شریک ہے۔" اس کی بیوی کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ دکھ اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکنے لگا۔ اس کی آواز ڈوب گئی۔ چپ۔ پھر اس کی بیوی ارد گرد بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھے بغیر سر کو آگے تک دوپٹے سے ڈھانپتے ہوئے بولی: "مرحوم کو یہ پسند نہیں تھا کہ میں اس طرح لوگوں سے اس کی موت کی تعزیت وصول کروں۔ لیکن میں اس لیے آپ لوگوں میں آ گئی ہوں کہ کہیں مرحوم نے آپ میں سے کسی کا کچھ دینا نہ ہو؟" سب نے قریباً ایک ہی وقت میں کہا۔ "نہیں، اس نے ہمارا کچھ نہیں دینا تھا۔ ہمیں اس کی موت پر بے حد دکھ ہوا ہے۔ مرحوم اچھا اور با اصول آدمی تھا۔ اس کے مزاج میں غصہ ضرور تھا مگر وہ دل کا برا نہیں تھا۔ اس نے اپنی انا کا کبھی سودا نہیں کیا۔

اس کی بیوی نے صوفے کے کونے کو انگلی سے کریدتے ہوئے کہا۔ "اسے سچ بولنے کا جنون تھا۔ وہ اپنے خون کے ہاتھوں مجبور تھا۔ بڑے تو کیا اس نے کبھی چھوٹے چھوٹے سمجھوتے بھی نہیں کیے۔ مجھے اپنے مرحوم شوہر پر فخر ہے۔"

ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بولا۔ "مرحوم دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن تھا۔ مگر اس کے دشمن بھی اس کے اصولوں کی قدر کرتے تھے۔ وہ اپنے اصولوں کی وجہ سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔"

"مرحوم کو اداسی اور تنہائی ویسے ہی پسند تھی۔" بیوی نے کہا۔

اتنے میں ایک خاکروب آیا اور اس کی بیوی کے قدموں پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ وہ اس قدر شدت اور اپنائیت سے رو رہا تھا کہ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو کوفت

ہونے لگی۔ کسی نے کہا "بس سوہنا مسیح بس۔ خدا کو یہی منظور تھا۔" مگر سوہنا مسیح بے اختیار روئے جا رہا تھا۔ کوئی دوسرا بولا: "مرحوم کو چٹھی رسانوں، ہوٹل کے بیروں، لائین مینوں، روئی دُھننے والوں اور خاکروبوں سے بڑی محبت تھی۔"

"مگر کاش! مرحوم کو زندگی سے بھی اتنی محبت ہوتی۔" کونے میں بیٹھے ہوئے شخص نے گھٹنوں پہ رکھے بازوؤں میں سے سر نکال کر کہا۔ "ہر وقت موت کی باتیں، موت کی تعریف، جیسے بچے عید کا انتظار کرتے ہیں۔"

پھر ابھی اس کا چالیسواں بھی نہیں ہوا تھا تو ایک کمپنی نے اس کی بیوی کو ملازمت کی پیشکش کی اور کمپنی کا مالک چل کر خود اس کے پاس آیا اور کہنے لگا "اگرچہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ مرحوم آپ کے ملازمت کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔ لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ آپ کو گھر بھی چلانا ہے۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں، پڑھ بھی رہے ہیں۔ انہیں بہتر تعلیم کی سہولتیں چاہئیں۔ ایسے وقت میں آپ کو آگے بڑھنا ہوگا۔"

مرحوم کی بیوی نے کمپنی کے مالک کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "جب تک مرحوم کی روح اس گھر میں آتی ہے میں آپ کی آفر قبول نہیں کر سکتی۔"

کمپنی کا مالک جھنجھلا کر بولا

"مگر مرحوم کی روح اب یہاں کیا لینے آتی ہے؟"

سڑک کی تصویر

شہر کی ایک سڑک اس کے ڈرائینگ روم کے عین بیچ سے گزرتی ہے۔ اس لیے اس کا گھر ہر وقت بسوں، ٹرکوں، کاروں اور سکوٹروں کے شور اور ہارن کی آوازوں سے بھرا رہتا ہے۔ وہ جھاڑن سے کر اکثر وقت ڈرائینگ روم میں پڑے سامان کی گرد جھاڑتا رہتا ہے۔ لیکن آنکھ جھپکنے کی دیر میں وہ پھر گرد سے اٹ جاتے ہیں۔ کوئی مہمان آ جائے تو اسے بٹھانے کے لیے ڈرائینگ روم میں جگہ نہیں ملتی۔ کیونکہ اکثر وقت عورتیں بچے اور بوڑھے صوفوں پر بیٹھ کر بس کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

جب سے وہ جوان ہوا ہے اس نے اپنے باپ سے کئی بار کہا ہے کہ شہر کی انتظامیہ سے کہا جائے کہ وہ یہ سڑک ان کے ڈرائینگ روم سے ہٹا کر دوسری طرف بنا دیں لیکن اس کا باپ یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے کہ یہ سڑک اس کے باپ دادا کے زمانے سے اسی ڈرائینگ روم کے عین بیچ سے گزرتی ہے۔ وہ اپنے باپ کی بات سن کر اکثر سوچتا کہ آخر ان لوگوں نے ڈرائینگ روم کے عین بیچ سڑک بنانے کی اجازت کیوں دی۔ کیا دنیا میں کوئی اور بھی ایسا گھر ہے جس کے ڈرائینگ روم کے عین بیچ سے شہر کی انتہائی مصروف سڑک گزرتی ہو۔

کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ سڑک کھود کر اس کا نام و نشان مٹا دے لیکن جب بھی وہ کدال لے کر آگے بڑھتا اوپر سے کوئی بس آجاتی، اور پھر ٹریفک کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ حتیٰ کہ وہ انتظار کر کر کے تھک جاتا اور اسے نیند آجاتی۔

ایک دن اس نے سڑک کھودنے کے لیے اپنے کچھ دوستوں کو بھی بُلا لیا اور ایک کونے پر ڈرائنگ روم سے ذرا باہر سرخ کپڑا لگا دیا۔ جس پر لکھا تھا "سڑک برائے مرمت بند ہے"، لیکن اونٹوں والے اس کی پروا کیے بغیر قطار در قطار اندر آتے چلے گئے اور صبح ہو گئی۔ بورڈ ہوا سے ایک طرف گر پڑا اور ٹریفک پھر رواں ہو گئی۔

شام کو وہ "سڑک زیرِ مرمت ہے" کا بورڈ پھر سے لگانے ہی والا تھا کہ دو نوجوان سکوٹر سوار آپس میں ریس لگاتے ہوئے آئے اور وہ سکوٹر کی زد میں آتے آتے بچا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کے ڈرائنگ روم سے گزرنے والا سڑک کا حصہ پار کیا ہی تھا کہ دو بسیں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی جدوجہد کرتی ہوئی سر پہ آپہنچیں۔ اتنے میں ایک ٹرک بھی آگیا اور وہ اس سے بچنے کی کوشش میں ڈرائنگ روم کے مینٹل پیس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ جس پر اس کے دادا کی تصویر بھی پڑی تھی۔ وہ صوفے پر پڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اس کا ہاتھ گیتی کے دستے پر گھوم رہا تھا۔ وہ آج رات اس سڑک کو کھود کر اس کا رخ موڑ دینا چاہتا تھا۔ لیکن صبح تک انتظار کے بعد بھی جب ٹریفک نہ تھمی تو وہ اٹھ کر ناشتے کی میز پر آگیا جہاں اس کے باپ نے اسے بتایا کہ آج تو اس کی شادی کا دن ہے۔

اس کی شادی ہو گئی۔ وہ ایک دن تو ڈرائینگ روم میں آیا ہی نہیں۔ لیکن جب کچھ مہمان آئے اور وہ ڈرائینگ روم میں گیا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ڈرائینگ روم میں لگی ایک قدیم تصویر وہاں نہیں تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ میں نے اتار دی ہے۔ کیا کبھی کوئی سڑک کی تصویر بھی ڈرائینگ روم میں لگاتا ہے۔

اس دن سے اب کوئی بھی گاڑی اس کے ڈرائینگ روم سے نہیں گزرتی۔
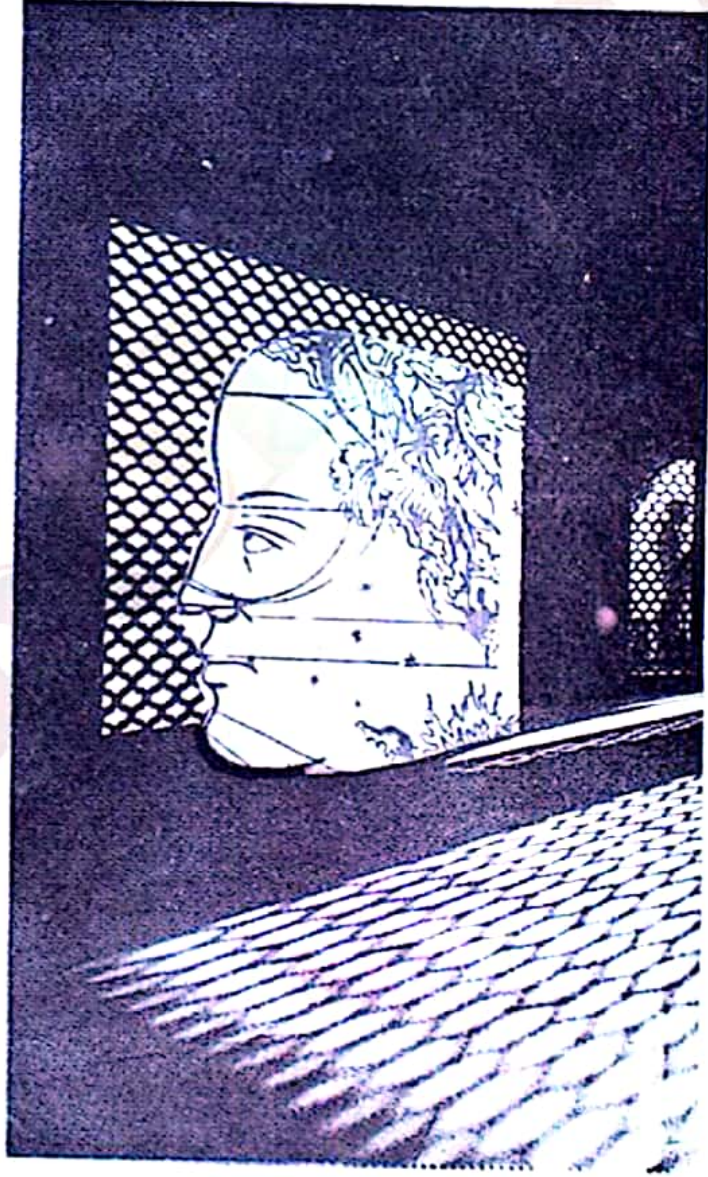
پورٹریٹ

رات بھی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی اور سڑک ویران پڑی تھی۔ میں بس سے اتر کر گھر کی طرف مڑا تو کوئی کمبل کی بُکل مارے تیز تیز قدم اٹھاتا میرے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ وہ اور بھی تیز چلنا چاہ رہا تھا۔ لیکن شاید وہ بہت دور سے پیدل چل کر آ رہا تھا اس لئے اس کی چال سے تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا میں نے اس کی چال ڈھال سے اسے پہچاننے کی کوشش کی لیکن وہ محلہ کا کوئی آدمی نہ تھا بلکہ کہیں باہر سے آیا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم چلا جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ میرے گھر کی طرف مڑ گیا ہے۔ اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس نے کمبل کھول کر اسے پھر سے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا، ادھر اُدھر دیکھا اور جلدی سے میرے گھر میں داخل ہو گیا۔ تجسس، حیرت اور غصے کے عالم میں، میں بھاگتا ہوا اپنے گھر میں داخل ہوا اور جلدی جلدی اسے ڈھونڈنے لگا۔ میری بیوی بھی پریشانی کے عالم میں دوڑتی ہوئی آئی اور بولی۔

"کیا ہوا؛ آپ اندر کیسے آئے؟"

میں نے اسے بتایا کہ گھر میں چور ہے۔ میں نے اسے ابھی اندر آتے دیکھا ہے۔ میری بیوی اور زیادہ گھبرا گئی خوف سے اس کی آواز کانپنے لگی۔ وہ بولی، میں

نے تو چٹخنی لگا ئی تھی۔ کوئی بڑا ماہر چور ہے جس نے چٹخنی بھی کھول لی ۔ مگر اس نے اندر سے چٹخنی کیسے کھولی ؟" میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر چور کو ڈھونڈتا رہا لیکن شاید وہ بھاگ گیا تھا۔ پھر جب ہم دونوں کو یقین ہو گیا کہ وہ بھاگ گیا ہے، تو ہم نے ایک بار پھر ہر کمرے میں جاکر اسے تلاش کیا۔ اور پھر مکمل یقین کر لینے کے بعد کہ وہ بھاگ گیا ہے، گھر کے سارے دروازے مضبوطی سے بند کر کے چٹخنیاں چڑھا دیں۔ باہر والے دروازے کو تالا لگا دیا۔ میری بیوی کہنے لگی۔ پچھلی جمعرات کو بھی مجھے شک پڑا تھا کہ گھر میں کوئی ہے۔ میرے خیال میں کوئی کافی عرصہ سے ہمارے گھر چوری کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پھر ہم سونے کے لئے لیٹ گئے لیکن نیند کو ہماری باتوں نے کھا لیا۔ میری بیوی نے پوچھا۔" اس کا حلیہ کیسا تھا؟" میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا وہ آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ وہ کوئی بوڑھا آدمی لگ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ یقیناً کوئی بوڑھا آدمی ہے، اور مجھے خاصا تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی: پچھلی جمعرات کو جب وہ آیا تو میں نے اس کے قدموں کی چاپ سُنی تھی۔ وہ ایک بار کھانسا بھی تھا اور مجھے یوں احساس ہوا تھا جیسے میں نے قدموں کی وہ آواز کبھی پہلے بھی سُنی ہے۔ کھانسی کی آواز بھی بڑی جانی پہچانی تھی اور ہاں میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ اس نے الماری سے گلاس نکال کر پانی بھی پیا تھا۔ کیونکہ اس دن وہ گلاس میز پر پڑا تھا جو میں صرف اس دن نکالتی ہوں جب کوئی مہمان آتا ہے۔ لیکن مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ وہ چٹخنی کیسے کھول لیتا ہے۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔ یہ وہ بابا تو نہیں جو اس دن بھی بچوں کو ٹانیاں دے گیا تھا۔ وہ جھنجھلائی ہوئی آواز میں بولی۔ اس دن بھی تو میں اسے نہیں دیکھ سکی۔ جب بچے ٹانیاں لے کر اندر آئے اور انہوں

نے مجھے بتایا تو میں اسی وقت باہر گئی لیکن بابا جا چکا تھا۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک کھانسنے کی آواز آئی۔ ہم دونوں گھبرا کر اٹھے اور سٹور کی طرف بھاگے کیونکہ کھانسنے کی آواز سٹور کی طرف سے آ رہی تھی۔ جب ہم نے سٹور کی بتی جلائی تو دیکھا کہ ایک بوڑھا اپنے کمبل کے پلو سے سامنے پڑے پورٹریٹ پر سے گرد صاف کر رہا تھا۔ بتی جلتے ہی اس نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ اور اس سے پہلے کہ میں اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھتا، وہ میری بیوی سے مخاطب ہوا۔ بی بی! تم نے مجھے پہچانا نہیں، میں بابا ہوں بابا۔ میری بیوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ صرف اتنا کہہ سکی ..... بابا.... میں نے دیکھا کہ بابا جس پورٹریٹ پر سے گرد صاف کر رہا تھا وہ اسی کا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ بابا اس کالج کا ماڈل تھا جہاں سے میری بیوی نے فائن آرٹس میں ایم۔ اے کیا تھا۔ اور بابا گھنٹوں لڑکیوں کے سامنے پوز بنا کے بیٹھا رہتا تھا اور لڑکیاں اس کا پورٹریٹ بنایا کرتی تھیں۔ میری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ بابا کا سب سے اچھا پورٹریٹ بنانے پر اس نے کلاس میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔

ایک دن وہ اسی طرح اسٹول پر بیٹھا تھا۔ لڑکیاں اس کا پورٹریٹ بنا رہی تھیں کہ بابا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہم تینوں چپ کھڑے تھے کہ اچانک بابا کی آواز نے سکوت توڑا۔ وہ بولا۔ بی بی! میں تمہارے گھر چوری کرنے نہیں آیا۔ تم نے میرا پورٹریٹ سٹور میں رکھ دیا ہے۔ اس پر گرد جم جاتی ہے۔ اسی لئے میں ہر جمعرات کو اپنے پورٹریٹ پر سے گرد صاف کرنے آتا ہوں۔
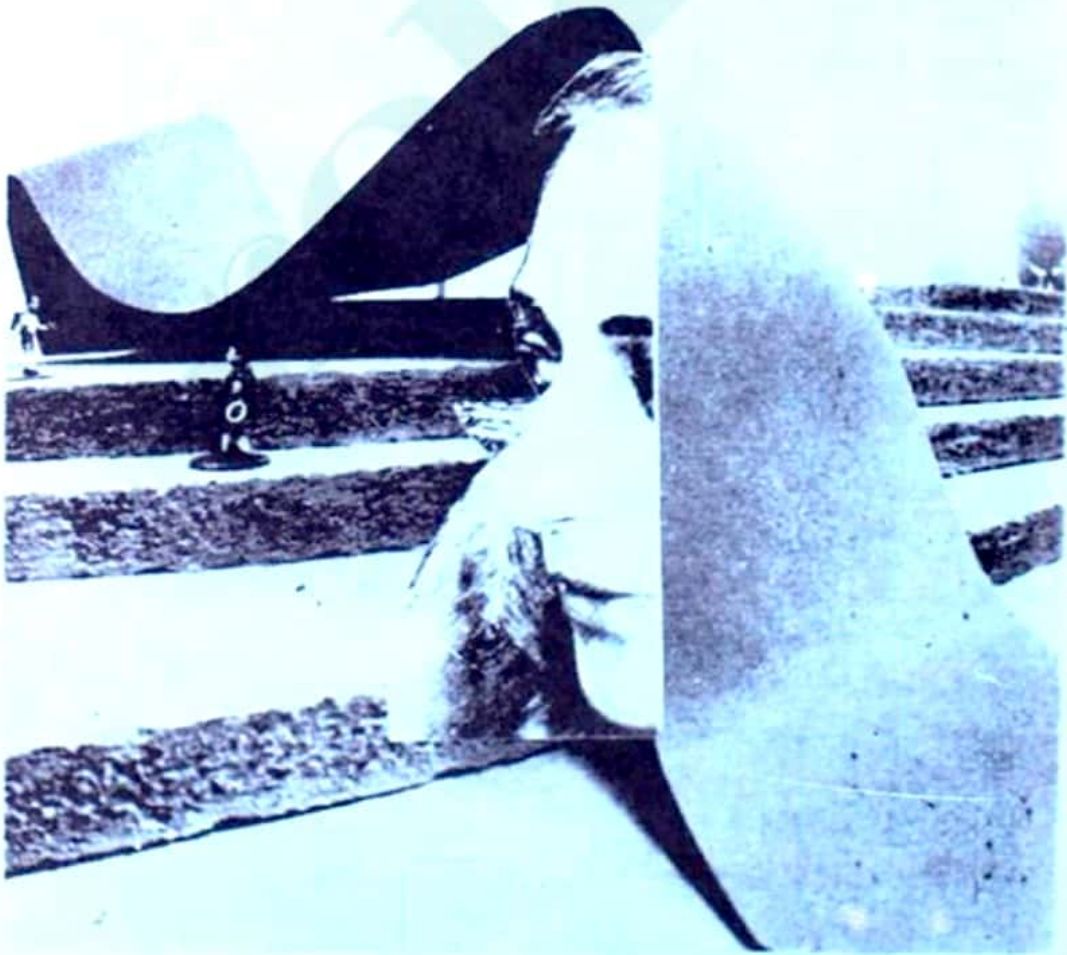
جلد ساز

وہ ایک جلد ساز ہے۔ اسے یہ کام کرتے ہوئے چالیس سال ہو گئے ہیں۔ وہ دس سال کا تھا جب اس نے اپنے باپ سے جلد بندی کا کام سیکھا تھا اور پھر جب اس کا باپ اسے تنہا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو اس نے دکان کا کام سنبھال لیا اور اب بقول اس کے کتابیں جلد کروانے کے لئے لوگ دور دور سے اس کے پاس آتے ہیں۔ جلد بندی کے بڑے بڑے آرڈر اسے ملتے ہیں اس کے کئی شاگرد ماہر جلد ساز بن چکے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک دن بھی اسکول نہیں گیا لیکن اردو اچھی طرح اور انگریزی کے لفظ اٹک اٹک کر پڑھ لیتا ہے۔ کیونکہ وہ جب بھی کسی کتاب کی جلد بندی کرتا ہے اس کا پہلا صفحہ ضرور پڑھتا ہے۔ وہ کتاب کا عنوان پڑھ کر اس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ اس کی دکان ایک محلے میں ہے کئی بار اس کے دل میں خیال آیا ہے کہ وہ بازار میں دکان لے لے۔ لیکن پھر وہ نجانے کیا سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیتا ہے۔ وہ اکثر کہتا ہے کہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے پیشے کی طرح جلد بندی کا پیشہ بھی بڑا مقدس ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کتاب کی سلائی کرتے ہوئے اگر کوئی لفظ سلائی میں آجاتا ہے تو وہ غصہ سے آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور کاریگر کو بری طرح ڈانٹتا ہے اور کہتا ہے اگر میں تمہاری گردن تمہاری قمیض کے کالر کے ساتھ سی دوں تو پھر.... تم نے صرف کتاب

کے ساتھ ہی زیادتی نہیں کی بلکہ لفظ پہ بھی قاتلانہ حملہ کیا ہے ..... لوگوں کا خیال ہے کہ اچھی جلد کرنا اس کی پیشہ ورانہ عادت ہے تاکہ لوگ اس کے کام سے خوش ہوں، اور اسے مزید کام ملے ۔ مگر وہ کہتا ہے کہ اچھی جلد بندی کرنا ایک نیک کام ہے ۔ یہ لفظوں کی حفاظت ہے ۔ اس طرح اچھے خیالات محفوظ ہو جاتے ہیں ۔

وہ کہتا ہے انسان اور کتاب بالکل ایک جیسے ہیں ۔ اچھی سوچیں بھی جلد کی طرح ہوتی ہیں جو انسان کے جذبوں کو مضبوط بناتی ہیں ۔ لیکن اس کے ایک خیال سے اس کے ساتھی اور دوست اتفاق نہیں کرتے ۔ وہ کہتا ہے عورت مرد کے لئے بالکل ایسے ہے جیسے کسی کتاب کی خوب صورت جلد، پھولدار، رنگین ۔ اس کے دوست اس کی اس بات کی مخالفت کرتے ہیں ۔ مگر وہ اپنے اس نظریے پہ قائم ہے ۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں اکثر کہتا ہے ۔ میں وہ کتاب ہوں جس کی جلد بندی نہیں ہوئی، اور میرے ورق اکھڑ اکھڑ جاتے ہیں ۔ اس کی شادی نہ کرنے کی وجہ بھی بڑی عجیب ہے ۔ کئی سال پہلے ایک لڑکی اس کے محلے میں رہتی تھی اور ایک بار اس کے پاس اپنی کتابوں پہ جلد کروانے آئی تھی ۔ اس کے بعد اس لڑکی کی شادی ہو گئی، وہ اپنے سسرال چلی گئی ۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ غلطی سے ایک کتاب کی جلد دوسری کتاب پہ چلی گئی ۔ پتہ نہیں یہ کس کی غلطی تھی مگر وہ آج تک اسے اپنی غلطی سمجھتا رہا ۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے اس کے پاس کچھ بچے اپنی کتابیں جلد کروانے کے لئے آئے ۔ ایک بچے نے کہا ۔ امی کہہ رہی ہیں پھولدار اور رنگین ابری لگانا ۔ اس نے گھوم کر دیکھا پھولدار چادر لئے دروازے سے لگی وہ کھڑی تھی ۔ اس نے گھبرا کر ادھر دیکھا ۔ اس کی جلد کی ہوئی کتابیں اردگرد اوپر تلے پڑی تھیں ۔ اسے چکر آگیا ۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے ساری کتابوں کی جلد بندی غلط کر دی ہے ۔

آندھی، اور کھلی کھڑکیاں

میں جب بھی اس کے شہر جاتا ہوں اسی کے گھر ٹھہرتا ہوں۔ وہ کئی سالوں سے ایک فلیٹ میں اکیلا رہتا ہے۔ اسے شروع ہی سے تنہائی اچھی لگتی ہے اور وہ اُداسی سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے میں جب کچھ دن اس کے ہاں قیام کرتا ہوں تو مجھ سے اکثر یہ فرمائش کرتا ہے کہ میں کوئی ایسی بات کردوں جس سے تنہائی کا احساس شدید ہو اور اداسی گھنی ہوجائے۔ لیکن جب میں ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہوں تو وہ پھر خود ہی اس کا قصہ چھیڑ دیتا ہے۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ جس لڑکی کا ذکر اس کی باتوں میں آتا ہے وہ کون ہے، کیسی ہے اور کہاں رہتی ہے۔ اور وہ اکثر اس کی باتیں کیوں کرتا ہے۔
اب کی بار بھی جب مجھے اس کے ہاں ٹھہرے ہوئے تین روز ہو گئے تو ایک دن کہنے لگا۔ میں اپنے ایک اور دوست کے گھر جا رہا ہوں۔ اس کے گھر کی اُداسی بڑی ذائقہ دار ہے۔ جب سے تم آئے ہو بلکہ تمہارے آنے سے کچھ دن پہلے میرے فلیٹ کی اُداسی بڑی پھیکی اور بدمزہ ہو گئی تھی۔
میں نے کہا تم نے اپنے جس دوست کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے گھر کی اداسی کا ذائقہ کیسا ہے۔ کہنے لگا۔ بہت اچھا ..... خالص .... اس میں کسی آس آواز کی ملاوٹ نہیں..... میں نے پوچھا کیا وہ بھی اکیلا ہی رہتا ہے؟

کہنے لگا ہاں وہ بھی اکیلا ہی رہتا ہے۔ لیکن اُداسی اور اکیلے پن سے ڈرتا ہے۔ اس نے اپنا اکیلا پن اور اُداسی مجھے دینے پہ رضامندی ظاہر کر دی ہے اور اب میں اس کے گھر جا کر اس کی اُداسی اوڑھتا ہوں اور اس کے اکیلے پن کا نشہ کرتا ہوں۔

"کیا وہ بھی شروع ہی سے اکیلا ہے"، میں نے پوچھا تو اس نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں وہ شروع سے اکیلا نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور تمہیں پتہ ہے جب کوئی کسی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو کتنی مزے کی تنہائی اور اُداسی ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے دوست کے گھر چلا گیا اور میں اس کے فلیٹ میں تنہا رہ گیا۔ میں نے سامنے میز پہ پڑی اس کی ڈائری اٹھا لی اور پڑھنے لگا لکھا تھا:

"تمہارا خط مل گیا ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ تم جس لڑکی سے بھی ملتے ہو اُسے تنہا اور اُداس کر دیتے ہو۔ لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ سب سے بڑی حقیقت تنہائی اور اُداسی ہے۔ اور اپنی پہچان کے لئے بہت ضروری ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار اس وقت تنہا ہو گیا تھا۔ جب میری ماں نے کہا تھا کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ پھر جب سکول جانے لگا اور کلاس میں فرسٹ آیا تو بھی میں تنہا اور اداس ہو گیا۔ پھر مجھے کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا۔ استادوں نے مجھے ذہین بچہ قرار دے دیا۔ میں سب کی نظروں میں آگیا تو تنہائی اور اُداسی اور بڑھ گئی..... اس دوران میرا باپ مجھے داتا صاحب لے گیا تو میری تنہائی اور اداسی کے رنگ پکے ہو گئے۔ شاید تمہاری بات درست ہو کہ میں جس لڑکی سے بھی ملتا ہوں، اسے تنہا اور اداس کر دیتا ہوں۔ لیکن تمہیں اس بات کا اندازہ کیسے ہوا؟ تم تو کبھی مجھ سے ملے بھی نہیں اور نہ ہی میں نے تمہیں کبھی کوئی خط لکھا ہے۔ بلکہ تمہارے ہر خط کا جواب ڈائری میں لکھ ڈالتا ہوں۔"

ڈائری کا صفحہ ختم ہو گیا۔ میں نے ابھی اگلا صفحہ پلٹا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے

فون اٹھایا۔ وہ دوست کے گھر سے بول رہا تھا۔ کہنے لگا دیکھو میرے کمرے کی کھڑکیاں بند کر دو۔ آندھی آنے والی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کر دیتا ہوں۔ تم کب آؤ گے؟ لیکن اس نے میری بات کا جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا موسم بالکل صاف تھا اور آندھی کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا اور ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کھڑکیاں بند کروں یا نہ کروں کہ پھر اس کا فون آیا۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں بند کر دی ہیں کہ نہیں۔ آندھی آنے والی ہے۔ میں نے کہا۔ موسم بالکل صاف ہے۔ بولا نہیں آندھی آنے والی ہے۔ جلدی سے میرے کمرے کی کھڑکیاں بند کر دو۔ اور بارش بھی ہو گی۔ میری چھتری الماری میں پڑی ہے، میں نے کبھی استعمال نہیں کی۔ ویسے بھی چھتری مجھے اچھی نہیں لگتی۔ تمہیں کہیں جانا ہو تو چھتری الماری سے نکال کر لے جانا۔ اور ہاں آندھی اور بارش کے موسم میں وہ مجھے ضرور فون کرتی ہے۔ اگر اس کا فون آئے تو سوری رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دینا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر فون کیا اور کہنے لگا۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ میرے دوست کے گھر کی اُداسی اور تنہائی کم ہو گئی ہے بے مزہ بھی، اور ہاں اگر اس کا فون آیا تو سوری رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دینا۔

کرسی پر نیم دراز ہو کر میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ میری توقع سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ اس کا فون تو نہیں آیا؟

میں نے کہا نہیں۔

اس نے کھڑکیوں کی چٹخنیاں چیک کیں اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں دیر تک چپ رہے۔ آخر اس نے چپ توڑی اور بولا۔ ایسے موسم میں اس کا فون ضرور آتا ہے۔ تم کہہ دینا سوری رانگ نمبر ہے۔ پھر وہ ڈائری پر کچھ لکھنے لگا۔ میں نے کتاب اٹھا لی۔ کئی صفحے لکھنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "فون تو نہیں آیا اس کا؟"

میں زیرِ لب مسکرایا اور کہا۔ "تم بھی بھیں ہو۔" کہنے لگا ایک دفعہ اس نے خط

میں شکایت کی تھی کہ فون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے مگر اٹھاتا کوئی نہیں. کہیں ایسا تو نہیں کہ بیل ہوئی ہو، اور ہم نے سنی نہ ہو..... میں ڈائری لکھ رہا تھا، تم کتاب پڑھ رہے تھے."

پھر وہ اٹھا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے بولا.

"آندھی تھمنے والی ہے." میں مسکرا کر چپ ہو گیا. ایک دو چکر کاٹنے کے بعد وہ فون کے قریب آیا. رسیور اٹھاتے ہوئے بولا.

"میرا خیال ہے میں اسے اطلاع کر دوں کہ مجھے فون نہ کرے. کیونکہ میں گھر پہ نہیں ہوں.
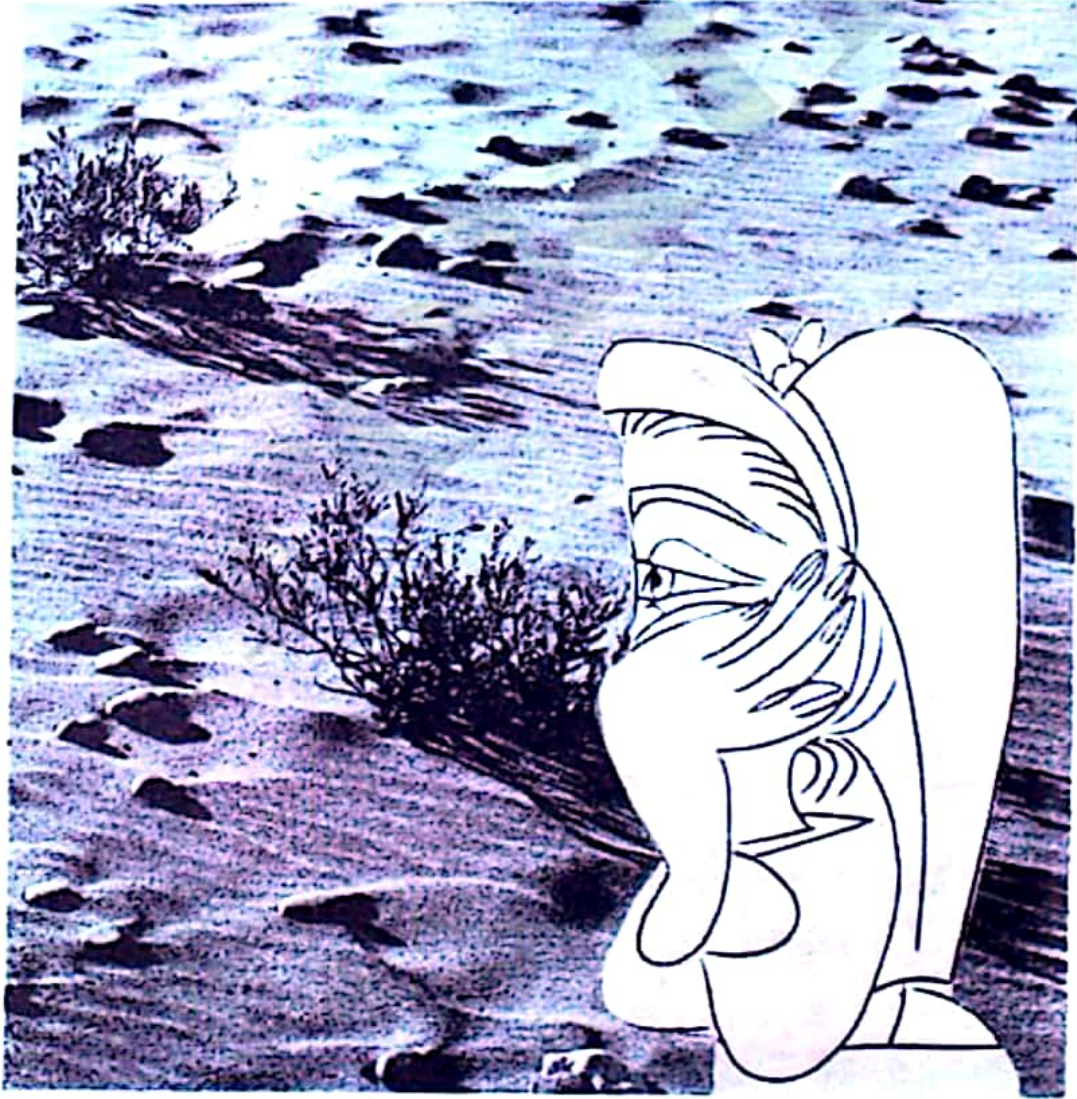
گڑیا مرنے نہیں دیتی

گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹکنا، اپنے پیٹ میں چھرا گھونپنا، زہر کھانا، اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر چلا دینا یا چلتی ٹرین کے آگے سر دے دینا اسے پسند نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اونچی عمارت سے چھلانگ لگا کر ہی خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور کئی دنوں کی تگ و دو کے بعد شہر کی سب سے اونچی عمارت کی چھت تک پہنچنے کا راستہ معلوم کر کے بالآخر چھت پر پہنچ گیا تھا اور اب نیچے چھلانگ لگانے کی سمت کا تعین کر رہا تھا خودکشی کا فیصلہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا اور یہ کوئی ایک آدھ دن کی سوچ نہیں تھی بلکہ کئی سالوں سے وہ اس بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ اس نے بعض احباب سے اس کا تذکرہ کیا تھا مگر ہر کسی کا یہی خیال تھا کہ وہ خودکشی کا ارادہ تو کر سکتا تھا، مگر اس پر عمل نہیں کر سکتا۔

خودکشی کی وجہ کسی سے کوئی جھگڑا یا محبوبہ کی بے وفائی بھی نہیں تھی۔ بس ایک خاص طرح کی تنہائی تھی جو محفل میں بیٹھے ہوئے بھی اس کے گرد لپٹی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور وجوہات بھی بیان کرتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اس کے برانڈ کے سگریٹ عام طور پر مارکیٹ سے نہیں ملتے۔ وہ اکثر اس لڑکی کا گلہ بھی کرتا جو کئی سالوں سے اسے جانتی اور پہچانتی تھی مگر جب بھی اس کے لئے چائے بنانے لگتی، اس سے پوچھتی۔ کتنی چینی؟ بلکہ کئی بار ایسا

بھی ہوا کہ جب اس کے لئے چائے کی دوسری پیالی بنانے لگتی، اس سے پھر پوچھتی
کتنی چینی؟ اس نے اس بارے میں کئی بار سوچا تھا کہ کیا وہ بنتی ہے یا واقعی بھول جاتی
ہے۔ یا ارد گرد بیٹھے لوگوں کو بتانا چاہتی ہے کہ اسے معلوم نہیں کہ وہ ایک پیالی چائے
میں کتنی چینی پیتا ہے مگر کئی بار جب وہ دونوں اکیلے ہوتے ہیں تو بھی وہ ایسا ہی کرتی ہے
پچھلے دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جس پوسٹ پر اس کی ترقی متوقع تھی، بڑے
صاحب نے اس پوسٹ پر ایک خاتون کو ترقی دے دی۔ وہ خواتین کا احترام کرتا تھا
بس میں سوار ہونے سے پہلے، کھانا شروع کرنے سے پہلے اور ایسی ہی کئی دوسری
باتوں میں وہ خواتین کو "پہلے آپ" کہنا نہیں بھولتا تھا۔ لیکن نوکری کے معاملے میں اس
کی رائے مختلف تھی اور اس حوالے سے وہ عورت ہونے پر قابلیت اور اہلیت کو فوقیت
دیتا تھا۔ اس نے ایک بار ایک افسر کو فون کیا تو اس کے پی۔ اے نے اسے بتایا کہ
صاحب مصروف ہیں اور اس سے بات نہیں کر سکتے۔ مگر اس وقت ایک خاتون نے اس
افسر کو فون کیا تو صاحب نے وقت نکال کر اس سے بات کر لی۔ ان باتوں نے بھی
اسے خودکشی پر اکسایا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ خودکشی کرے گا۔ ابھی وہ اپنے
فیصلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک بااثر آدمی اس کے پاس سے ایک غیر قانونی کام کروا کر
لے گیا۔ مگر الزام اس پر عائد کیا گیا۔ اس نے سب کو اصل صورت حال بتائی اور شور مچایا کہ
اس میں اس کا کوئی قصور نہیں مگر اس کے باوجود اسے معطل کر دیا گیا اور اس کے خلاف
انکوائری شروع ہو گئی۔ اس نے انکوائری کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا اور
فیصلے کا اندازہ کر کے خودکشی کی غرض سے شہر کی سب سے بڑی عمارت سے چھلانگ لگانے
کے لئے اب اس وقت چھت پر کھڑا تھا۔

شہر نیچے کسی دریا کی طرح بہہ رہا تھا، ٹیکسیاں، کاریں، ٹرک، اسکوٹر، بسیں، فٹ پاتھ
پر چلتے لوگ، اس نے زندگی میں پہلی بار یہ سب کچھ اتنی بلندی سے دیکھا تھا۔ اسے یوں

لگا جیسے سارا شہر اس کی مٹھی میں ہے۔ شہر کی مہک اسے ایسے محسوس ہوئی جیسے بارش میں بھیگا ہوا کوئی شخص آگ کے سامنے بیٹھا اپنے جوتے سکھا رہا ہو۔ اس مہک میں انتظار اور جدائی کی مہک بھی رچی ہوئی تھی۔

اس کی نظر ایک گھر کی کھڑکی پر پڑی۔ جہاں ایک لڑکی اپنے لمبے بال پھیلائے کنگھی کر رہی تھی.... اتنے لمبے بال.... ایک لمحہ کے لئے اسے یوں محسوس ہوا، جیسے لڑکی کے بال شہر کی سڑک پر بھاگتی گاڑیوں میں اُلجھ گئے ہیں۔ جب بھی کوئی اڑچن کھولنے کے لئے وہ بالوں میں کنگھی رکھ کر اسے زور سے جھٹکتی تو اسے لگتا جیسے وہ شہر کی سڑک پر بھاگتی گاڑیوں میں اُلجھے اپنے بالوں کو رہا کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔

پھر اس کی نظر ایک فقیر پر پڑی، جس کا لباس نہ ہونے کے برابر تھا اور بالوں میں اتنی پکی اڑچنیں پڑ چکی تھیں کہ انہیں کھولنا ناممکن تھا۔ اس نے اس فقیر کو پہلے بھی کئی بار بالکل قریب سے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت اسے وہ فقیر میلا لگا تھا مگر اب بہت زیادہ صاف ستھرا نظر آ رہا تھا اور اس کے قریب ہی وہ گٹھڑی بھی پڑی تھی، جس میں وہ میلے گندے کپڑے، کاغذ اور فضول چیزیں جمع کرتا رہتا تھا۔ مگر اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے گٹھڑی میں میلے فضول کاغذ نہیں بلکہ گلے اور شکوے بندھے ہوئے ہیں۔

پھر اچانک اس نے دیکھا کہ ایک بچی اپنی ماں کی انگلی پکڑے سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہی ہے مگر تیزی سے سڑک پار کرتے ہوئے بچی کے سینے سے لگی ہوئی گڑیا سڑک کے عین بیچ میں گر پڑتی ہے۔ اب ماں اور بیٹی سڑک کے اس پار کھڑی ہیں اور گڑیا سڑک کے عین بیچ پڑی ہے۔ گڑیا نے گوٹے والے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور اسے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ گڑیا کے کپڑوں کا رنگ سرخ ہے اور اس کے کانوں میں بھی کچھ چمک رہا ہے۔ جو یقیناً بالیاں یا کانٹے ہیں۔ وہ سانس روک لیتا ہے۔ اشارہ کھلتا ہے اور اب خطرہ ہے کہ کوئی گاڑی گڑیا کو کچلتی ہوئی آگے

بڑھ جاتے گی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور بڑی مشکل سے گڑیا کو بچاتا ہے۔ پھر ایک اسکوٹر کا پہیہ بالکل گڑیا کے قریب سے گزر جاتا ہے۔ رکشہ بالکل گڑیا کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے مگر جب ہاتھ ہٹاتا ہے تو گڑیا کو صحیح سلامت دیکھ کر وہ انجانی سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ اچانک اسے دور سے ایک بس آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگتا ہے اور وہ سوچتا ہے بس اب تو گڑیا نہیں بچ سکتی۔ پھر یکدم اس کے اندر بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جلدی سے مڑتا ہے اور گڑیا کو بچانے کے لئے تیزی سے اس بلند عمارت کی سیڑھیاں اترنے لگتا ہے۔

چاروں طرف پانی

صبح جب وہ اپنے گھر کے باتھ روم میں آئینے کے سامنے کھڑا شیو کر رہا تھا اور شیونگ کریم کے جھاگ نے اس کی ٹھوڑی کو ڈھانپ رکھا تھا تو عین اس وقت وہ سب ایک جگہ اکٹھے ہو کر اسے نیچا دکھانے کے بارے میں سکیمیں سوچ رہے تھے۔ جس وقت وہ مزے سے نہا رہا تھا اور پانی اس کے بدن کو خوشی دے رہا تھا تو وہ سب جو شہر کے ایک گھر کے ڈرائنگ روم میں جمع ہو کر اس کے بارے میں سکیمیں سوچ رہے تھے۔ عین اس وقت اس کے خلاف قرارداد پاس کرنے پر متفق ہو گئے تھے اور جب اس نے تولیہ اپنے گرد لپیٹنا شروع کیا تو انہوں نے اس کے خلاف قرارداد ڈرافٹ کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ سب بولتے جا رہے تھے اور ایک درمیانے قد کا آدمی جس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے عیاری اور مکاری ٹپک رہی تھی لکھتا جا رہا تھا۔ ہر کوئی اس کے خلاف نفرت اُگل رہا تھا۔ جب وہ بالوں میں کنگھی کر رہا تھا وہ اس کے خلاف قرارداد میں لکھ رہے تھے ”وہ انتہائی بدمزاج آدمی ہے اور کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں“ جب وہ لباس تبدیل کر رہا تھا تو عین اس وقت وہ قرارداد میں اس کے بارے میں لکھ رہے تھے ”وہ ایک انتہائی اختلافی آدمی ہے اور شہر کا کوئی شخص اسے پسند نہیں کرتا۔ پھر اس وقت جب وہ خوشبو لگا رہا تھا تو عین اس وقت انہوں نے قرارداد کا اگلا جملہ ڈرافٹ

کیا۔ اسے ہماری باتوں سے بُو آتی ہے۔ وہ ہر وقت ہمارے چہروں پر جمی میل کا ذکر لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ جب وہ ناشتے کی میز پہ دودھ کی پیالی میں شہد گھول رہا تھا تو انہوں نے اس کی زندگی میں زہر گھولنے کا منصوبہ مکمل کر لیا تھا اور جب دفتر جانے کے لئے اس نے گھر سے باہر قدم رکھا تو عین اس وقت انہوں نے قرارداد کا آخری جملہ ڈرافٹ کیا۔

"اس لئے ارباب اختیار سے استدعا کی جاتی ہے کہ اسے نوکری سے نکال دیا جائے"۔

وہ بھی عجیب آدمی ہے اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ وہ سچ کہتے ہیں کہ وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتا۔ لیکن وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ وہ تنہائی پسند ہے مگر اپنے آپ سے مطمئن ہے۔ وہ الگ تھلگ رہ کر جینا چاہتا ہے۔ مگر وہ اسے اپنی طرز کی زندگی گزارنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں۔ وہ ان سب سے مختلف ہے اس کی سوچ مختلف ہے۔ اس کی آنکھوں میں دلکشی ہے۔ پتہ نہیں وہ ایسا کیوں ہے؛ وہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کی طرف توجہ نہ دے۔ پھر بھی وہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

پھر اس دن جب وہ سوئمنگ پول میں تیر رہا تھا اور لطف محسوس کر رہا تھا تو وہ سب سارے شہر میں گھبرائے ہوئے اور بے چین پھر رہے تھے تاکہ دوسرے لوگوں سے بھی اس کے خلاف قرارداد پر دستخط کروائیں۔ وہ اطمینان سے پول کے کنارے لیٹ گیا۔ اسے علم بھی نہیں تھا کہ عین اس وقت سخت گرمی میں کچھ لوگ اسے نیچا دکھانے کے لئے زبردست مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج شام تک اس کے خلاف قرارداد پاس کر کے ارباب اختیار کو بھیج دی جائے۔

جب وہ ننھے منے بچے کو پانی سے کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو وہ قرارداد کو آخری بار پڑھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ اس کے خلاف جس قدر زہر ان کے دل میں ہے وہ قرارداد میں منتقل نہیں ہو سکا۔

اس دن جب لان میں بیٹھا جوائس کیرول اوٹس کی نئی کہانی پڑھ رہا تھا تو وہ سب ایک تنظیم بنانے کے بارے میں غور کر رہے تھے تاکہ علم اور دانشوری کی آڑ میں اسے نیچا دکھانے کا منصوبہ مکمل کیا جا سکے اُسے شکست دی جا سکے۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔

کوئی پوچھ سکتا ہے کہ اس کا قصور کیا تھا۔ وہ سب لوگ اس کے خلاف کیوں تھے؛ جب وہ اطمینان سے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار رہا تھا تو پھر وہ سب کس مصیبت میں مبتلا تھے۔ اس کے خلاف سازشیں کیوں سوچتے رہتے تھے۔ اس بات کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل سکا۔ حتّٰی کہ جب وہ بڑے سکون سے سو رہا ہوتا ہے تو وہ اسے نیچا دکھانے کے لئے سارے شہر میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ اس کی ترقی روکنے کے لئے پلان بناتے ہیں۔ اب کچھ دنوں سے یہ حال ہو گیا ہے کہ صبح جب وہ دعا مانگ رہا ہوتا ہے تو وہ اس کے خلاف نئی نئی خبریں جمع کرنے نکل پڑتے ہیں۔ وہ کس سے ملا۔ اس نے کون سی کتاب خریدی، اس کے بارے میں کون کلمہ خیر کہہ رہا ہے۔ کیا اس کے لئے ابھی تک جینا حرام ہوا ہے یا نہیں؛

جب وہ اپنے دوست متین مین کے پاس بیٹھا اس کی محبوبہ کی باتیں سن رہا تھا، تو اسے شہر بدر کرنے والوں میں سے ایک بولا۔ میں نے سُنا ہے بہت سی لڑکیاں اسے خط لکھتی ہیں۔ دوسرا بولا۔ لکھتی ہیں، اسی لئے تو مجھے اس سے نفرت ہے۔ ایک اور بولا۔ میں نے سُنا ہے کہ اس کی بیوی بھی اس سے بہت تنگ ہے۔

ہاں کیوں نہ ہو۔ ایسے لوگوں سے کون تنگ نہیں ہوتا۔ بڑا اصول پرست بنا پھرتا ہے۔ کہتا ہے مجھے جھوٹ اچھا نہیں لگتا۔

پھر اس دن جب وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کام کر رہا تھا اور وہ بڑی محنت سے اس کے بارے میں خبریں اکٹھی کر رہے تھے تو ان میں سے کسی کے ہاتھ یہ خبر لگ گئی کہ وہ کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی انہوں نے ہنگامی اجلاس طلب کیا اور مزے

لے لے کہ وہ خبر سب کو سنائی اور تجویز کیا کہ اس خبر کو زیادہ سے زیادہ اچھالا جائے۔

پھر جب وہ شام کی چائے پی رہا تھا۔

تو وہ اس کے لئے نفرت پھیلا رہے تھے۔

جب وہ اپنے ایک دوست کو خط لکھ رہا تھا۔

تو وہ اس کے بارے میں ارباب اختیار کو خط لکھ رہے تھے۔

جب وہ اپنے مشین مین دوست سے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو راستہ دے دے اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو وہ لوگ عین اس وقت چاروں طرف سے اس کا راستہ روکنے کے لئے دلیلیں پیش کر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

آخر ایک دن میں اس سے ملنے چلا گیا۔ وہ کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا اور بڑے مزے سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ میں نے اسے اس قدر مطمئن دیکھ کر کہا۔

"تمہیں پتہ ہے وہ تمہارے بارے میں کتنے بے چین ہیں اور تم اس قدر پرسکون ہو"۔

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

'یہ نئی کتاب آئی ہے۔ کیا تم نے پڑھی ہے؟'

مٹھی بھر لفظ

وہ بڑی فضول خرچ ہے۔
پیسے بالکل خرچ نہیں کرتی۔
صرف لفظوں کی فضول خرچی کرتی ہے۔
میں جب بھی اس سے کہتا ہوں کہ لفظوں کی فضول خرچی نہ کیا کرو۔
لفظ بڑے معصوم اور مقدس ہوتے ہیں۔
تو وہ کہتی ہے۔
لفظ تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے اتھرے گھوڑے ہیں اور میں نے انہیں لگامیں ڈال کر قابو کر لیا ہے۔
میں کہتا ہوں۔
تمہیں وہم ہے لفظ کسی کے قابو میں نہیں آتے۔ لفظ پناہ نہیں مانگتے بلکہ پناہ دیتے ہیں۔
وہ کہتی ہے۔
میں نے کب کہا ہے کہ لفظ پناہ نہیں دیتے لیکن یہ بھی بتا دوں کہ اگر لفظ ادیب کے ہاتھوں سے نکل جائیں تو پھر انہیں حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میں اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں

لفظ تو مشکل میں کام آنے والے دوستوں کی طرح ہوتے ہیں

وہ مجھے سمجھاتی ہے۔

لفظوں کی دوستی بڑی مہنگی پڑتی ہے

میں مسکراتا ہوں

مجھے لفظوں سے دوستی کرنا آتی ہے

وہ مسکراتی ہے۔

لفظ دل کی گہرائیوں سے چاہنے والی محبوبہ کی طرح ہوتے ہیں

میں کہتا ہوں

یہ تو سچ ہے

وہ کہتی ہے

اگر یہ سچ ہے تو پھر تم مجھے لفظوں کی فضول خرچی کا طعنہ کیوں دیتے ہو

میں کہتا ہوں۔

اس لیے کہ جب تم کچھ لکھتی ہو تو ضرورت سے زیادہ لفظ استعمال کرتی ہو۔

کیا بار بار اس بات کی تکرار مناسب ہے کہ " میں بہت اداس ہوں "۔

" میں بہت اداس ہوں "۔

وہ بگڑ جاتی ہے۔

تم مجھے الزام دے رہے ہو۔ لفظوں کی فضول خرچی تو سب سے زیادہ ادیب

کرتے ہیں ان کی بے حرمتی کرتے ہیں - ان سے کھیلتے ہیں اور ان کا حلیہ بگاڑ

کر رکھ دیتے ہیں - میں نے ایسے کئی ادیبوں کی کتابیں پڑھی ہیں

اگر ساری کتابوں میں ٹوٹل ۲۰ کلو لفظ ہوں تو ان میں سے دس کلو لفظ فالتو ہوتے

ہیں۔ اب بتاؤ ادیب فضول خرچ ہیں کہ میں جو دل کی بات کہتی ہوں تو تم مجھے فضول خرچ کہتے ہو۔۔۔ ۔۔۔۔ کیا ادیبوں نے لفظوں کی دولت پانی کی طرح نہیں بہائی ۔

میں کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا ۔۔۔۔ پھر بولا مگر منٹو بھی تو تھا جس نے پیسہ پانی کی طرح بہایا مگر لفظوں کی فضول خرچی کبھی نہیں کی ۔

وہ بولی ۔

ڈی ایچ لارنس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ٹالسٹائی نے کیا کم لفظ استعمال کیے ہیں ۔

میں نے اس سے کہا۔

کافکا بھی تو ہے جس کی کہانیوں اور تحریروں میں ایک لفظ بھی فالتو نہیں ۔

وہ جھنجھلا کر بولی ۔

مگر تم مجھے لفظوں کی بچت کا سبق کیوں پڑھا رہے ہو ۔

میں نے کہا ۔

اس لیے کہ لفظ گرانقدر انسانی سرمایہ ہیں اور اگر یہ سرمایہ ختم ہو گیا تو ہم ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے ۔زندگی ہمارا ساتھ چھوڑ دے گی اور تم بھی پھر یہ کیسے کہہ سکو گی کہ

" میں بہت اداس ہوں "

" وہ بولی

میں تو لفظوں کو محسوس بھی کر سکتی ہوں ۔

میں نے اس سے پوچھا۔

کیا تم نے کبھی لفظوں کو چکھا ہے۔

وہ بولی۔

ہاں پھگن اور چیت کے مہینوں میں ہری کچوری امبیوں کی طرح ، اب کیا بتاؤں تمہیں ان کا ذائقہ کیا ہوتا ہے ۔

میں خود بھی اسے محسوس کرتا ہوں لیکن تمہیں نہیں بتاؤں گا ۔

چلو اب بتا بھی دو ۔ لفظوں کی فضول خرچی کا اسقدر بھی خیال نہ رکھا کرو ۔

میں لفظوں کا اس لیے خیال رکھتا ہوں کہ مجھے لفظوں سے محبت ہے ۔

تمہارا کیا خیال ہے میں لفظوں سے محبت نہیں کرتی ۔

اگر تمہیں ان سے محبت ہوتی تو تم انہیں سنبھال کر رکھتی ۔

سنو ، تحریریں لفظوں کے جزدان ہیں ۔ تم کیوں لفظوں کے وکیل بنے بیٹھے ہو ۔

اس لیے کہ مجھے ان لفظوں پہ ترس آتا ہے جو اپنی ذہنی امارات کی تشہیر کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ۔ لفظ پر انسان کی صحبت کا بہت اثر ہوتا ہے ۔

بری صحبت میں رہ کر لفظ بھی برے ہو جاتے ہیں ۔

اسی لیے تو میں کہتی ہوں لفظ مجھ سے بہت خوش ہیں ۔

لفظ کسی کی میراث نہیں ۔

ہاں لیکن لفظ ہمیشہ نرم دل لوگوں کی صحبت میں رہنا پسند کرتے ہیں ۔

سنو ، لفظ مظلوم ہی نہیں ظالم بھی ہوتے ہیں ۔

تمہارے ساتھ کوئی ظلم کیا ہے لفظوں نے ۔

ہاں ایک بار ، جب وہ جدا ہو رہا تھا ۔ اس کے کہے ہوئے لفظ کچھ نہ پوچھو تلوار سے کم نہ تھے ۔

وہ جنہیں تم تلوار سمجھ رہی ہو ۔ لفظ نہیں تھے ۔ لفظوں پر اس کی فطرت کا سایہ تھا ۔

مگر اب کی بار اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ ہو گئی ۔ جب

اس کی چپ کافی لمبی ہو گئی تو میں نے اس سے کہا۔ اب بتاؤ نا وہ لفظ تھے یا جدا ہونے والے کی فطرت کا سایہ ... مگر وہ چپ ہی رہی۔ میں نے اسکی چپ سے تنگ آکر کہا اب جواب دو نا۔

تب وہ بولی

"میں اتنی فضول خرچ بھی نہیں جتنی تم سمجھتے ہو"۔

اور پھر چپ ہو گئی۔

بوچھاڑ

یہ بات عالم بالا کی ہے اور اس کہانی کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں کسی قسم کی مماثلت محض اتفاق ہوگا۔ یہ اس کی موت کے تین دن بعد کا واقعہ ہے اور عالم بالا کا ہے۔ وہ ایک برآمدہ نما جگہ لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ ایسے بنچ عام طور پر ویٹنگ روم، کلاس روم، پارکوں، ہسپتالوں یا ان کمروں کے باہر پڑے ہوتے ہیں جہاں انٹرویو کے لیے آئے ہوئے امیدوار بیٹھتے ہیں۔ اس کی عمر لگ بھگ چالیس سال ہوگی، مگر اس کے چہرے اور بالوں سے اس کی عمر زیادہ لگ رہی تھی۔ وہ منتظر تھا اس کی کیفیت اس شخص جیسی تھی جو کسی دیہات سے ضلع کچہری تاریخ بھگتنے آیا ہوتا ہے اور عدالت کے باہر بیٹھ کر اپنے نام کی آواز پڑنے کا منتظر ہوتا ہے.... فلاں ولد فلاں حاضر ہو۔

اتنے میں ایک لڑکی وہاں سے گزری۔ اس لڑکی کو عالم بالا پر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اپنی زندگی میں زمین پر جب وہ اس لڑکی سے ملا تھا تو اس کی باتیں سن کر اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ لڑکی کبھی مر سکتی ہے۔ اس کی باتوں میں اس کے براؤن بالوں اور گورے رنگ کا نشہ تھا اور اس کی براؤن اور نیلی آنکھوں میں موت کا احساس تک نہیں تھا۔

وہ لڑکی بھی اسی بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی اور بولی، تمہیں مرے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں۔

تین، وہ اس کی براؤن اور نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، اور تم....؟

مجھے بھی اتنے ہی دن ہوئے ہیں لڑکی نے اپنے بال درست کرتے ہوئے کہا، کیا آج تمہارے حساب کتاب اور فیصلے کا دن ہے؟

ہاں .... مجھے معلوم ہے کہ میرے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا۔

لڑکی مسکرائی، تم ویسے کے ویسے ہی ہو۔

تم کونسا بدل گئی ہو،

وہ دونوں چپ ہو گئے اور کچھ دیر تک چپ بیٹھے رہے .... اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔

لڑکی اٹھ کر پرے ہو گئی، مگر وہ یونہی تیز بوچھاڑ میں بیٹھا رہا۔ بوچھاڑ کنکروں کی طرح اسے لگ رہی تھی۔

وہ گردن سہلانے لگا۔ اتنے میں وہ بولی۔ ادھر آ جاؤ بارش بہت تیز ہے۔

مگر وہ اپنی جگہ سے ذرا سا بھی نہ ہلا اور بولا۔ میں تو ساری زندگی بوچھاڑ میں بیٹھا رہا ہوں اب بھی سہہ لوں گا۔

آج تم سگریٹ نہیں پی رہے۔

بہت کوشش کی ہے مگر ملتے ہی نہیں

وہ مسکرائی، اچھا ہوا ہے تمہیں کہا تھا نا کہ زندگی میں ہی کم کر دو یا چھوڑ دو، مگر تم مانے نہیں دیکھو آج تمہیں کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔

وہ چپ رہا .... وہ اور پرے ہٹ گئی۔ مگر وہ بوچھاڑ کی زد میں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ بولی، تمہارے بچے اور بیوی تمہیں بہت مس کر رہے ہوں گے۔

میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا یہ قدرت کا قانون ہے۔ انہوں نے میری موت سے سمجھوتہ کر لیا ہوگا۔

اس نے اپنے پرس میں سے ایک چھوٹا سا آئینہ اور لپ سٹک نکالی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے ہونٹوں پر لپ سٹک لگائی پھر آئینہ واپس پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔ تمہیں تو بہت پہلے مر جانا چاہیئے تھا یا خودکشی کر لینی چاہیے تھی تمہیں تو اس کا شوق بھی تھا۔

یہ درست ہے کئی بار میں نے ارادہ بھی کیا مگر ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے اس کام میں دیر ہوتی رہی۔

اتنی دیر تم کیا ڈھونڈتے رہے؟

میں محبت ڈھونڈتا رہا۔

محبت تو تمھاری قسمت میں لکھی ہی نہیں گئی تھی۔

یہ درست ہے اسی لیے تو مجھے کسی نے کبھی برداشت نہیں کیا۔ جو بھی ملا اس نے مجھے قبول کرنے کی بجائے مجھے اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ شروع میں جس نے کہا، مجھے تمھاری کوئی بات بری نہیں لگتی بعد میں اس نے بھی مجھے برا کہا۔

میرا خیال ہے اللہ تعالیٰ تمہیں دوزخ میں بھیج دے گا۔ وہ اس کے بھیگے ہوئے لباس کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

اس کا فیصلہ تو ابھی ہوگا مگر میں خدا سے ضرور پوچھوں گا کہ مجھے دوسروں سے اس قدر مختلف کیوں بنایا تھا۔

میری قسمت میں اداسی کیوں لکھی تھی۔

بارش اب تھم گئی تھی۔ وہ پوری طرح بھیگ چکا تھا اور اس کے لباس سے پانی ٹپک رہا تھا...

اس نے اپنے بالوں کو خشک کرنے کے انداز میں جھٹکا اور بولا چلو اچھا ہوا، میری بیوی، بچے اور دوسرے لوگ زندگی بھر میرے خلاف ثبوت اکٹھے کرتے رہتے تھے۔ اب ان کی محنت بھی ٹھکانے لگی۔

اتنے میں اس کے نام کی آواز پڑی۔ وہ چونک کر اٹھا۔ لڑکی نے بیگ کندھے پر جمایا اور آگے بڑھتے ہوئے بولی... تمہارے جیسے لوگ مر کر بھی ایسے ہی رہتے ہیں.....

شام باتوں میں چابیوں کا ذکر

وہ خودکشی کے ارادے سے شہر کی سب سے بڑی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہو گئی جو سیڑھیوں پہ جھک کر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ رک گیا۔ اس کا ایک پیر اوپر اور ایک نیچے والی سیڑھی پہ تھا۔

"کیا چیز گم ہو گئی ہے؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔ لڑکی چپ رہی اور اس کی نظریں بار بار سیڑھیاں اترتی اور چڑھتی رہیں۔

"کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

"میرے گھر کی چابی گم ہو گئی ہے۔" لڑکی نے اس کے تازہ پالش شدہ جوتوں پہ نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

وہ بھی جلدی سے چابی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں گھمانے لگا اور جب اس کی نظریں دو تین سیڑھیوں کے چکر کاٹ چکیں تو اس نے لڑکی کے سینڈل سے باہر جھانکتے ہوئے خوب صورت پیروں پہ نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"کس قسم کی چابی تھی؟"

"پورا 'گچھا' تھا۔ جس میں گھر کے باہر والے دروازے کے علاوہ اندر کے کمروں اور الماریوں کی چابیاں بھی تھیں۔"

"ہو سکتا ہے چابیاں یہاں نہ گری ہوں، اور گھر سے یہاں آتے ہوئے راستے
کہیں گر گئی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"آپ کا گھر یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"زیادہ نہیں، کوئی ایک میل ہوگا اور میں ہر روز صبح پیدل ہی دفتر آتی ہوں۔"

"میرا خیال ہے آپ جس راستے سے آئی ہیں، اس راستے پہ تلاش کرنے سے چابیاں
مل سکتی ہیں۔ آیئے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ دونوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔ لڑکی کی کیفیت اس چابی کے "رنگ"
جیسی تھی جس میں پڑی چابیاں کسی نے نکال کر دوسرے رنگ میں ڈال لی ہوں۔ اور خود
اس کی کیفیت ایک زنگ آلود تالے کی طرح تھی جو کسی ایسے گودام کے دروازے پہ لٹکا
ہوا تھا۔ جو کب کا خالی تھا مگر ویسے ہی احتیاطاً اس پہ تالا ڈال دیا گیا تھا۔

سڑک پہ پہنچ کر لڑکی نے اسے وہ راستہ سمجھایا جہاں سے گزر کر وہ دفتر آئی تھی مگر
جب وہ چابیاں تلاش کرنے کے لئے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ لڑکی نے پہلی بار اس کی
آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔ "آپ کو زحمت ہو گی، میں خود ہی ڈھونڈ لیتی ہوں۔ یقیناً آپ کسی
ضروری کام سے جا رہے ہوں گے۔" اس نے لڑکی کے متفکر چہرے کو غور سے دیکھا اور
بولا۔ "ہاں میں واقعی ایک ضروری کام سے جا رہا تھا۔ مگر آپ کے گھر کی چابی تلاش کرنا
بھی میرے خیال میں بہت ضروری ہے۔"

"میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ آپ جس کام سے جا رہے تھے اس سے میرے گھر کی چابیاں
تلاش کرنا زیادہ ضروری ہے۔ آپ کس کام سے جا رہے تھے؟"

وہ چپ رہا اور چابی کی تلاش میں سڑک پہ نظریں گھمانے لگا۔ مگر وہ کچھ دیر کے لئے
اپنے گھر کی گمی ہوئی چابیوں کو بھول گئی اور بولی۔ "مجھے دو قسم کی باتوں سے نفرت ہے۔"

اس نے چونک کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کس قسم کی باتوں سے۔ اتنے میں وہ خود ہی بولی۔

"ایک وہ لڑکی جو اظہار محبت کے جواب میں پوچھے "تم مجھ سے محبت کیوں کرتے ہو؟ مجھ میں تمہیں کیا بات نظر آتی ہے؟ اور ایک وہ مرد جو کسی ضروری کام کا حوالہ دے اور پھر یہ نہ بتاتے کہ اس ضروری کام کی نوعیت کیا ہے۔ میں اس بات سے چڑ جاتی ہوں۔"

کچھ دیر تک وہ دونوں چپ رہے۔ مگر پھر وہ بولا۔

"میں ایسے کام سے جا رہا تھا کہ آپ....."

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا مگر جب اس نے محسوس کیا کہ وہ ضروری کام کے بارے میں جانے بغیر اس سے بات نہیں کرے گی تو کہنے لگا۔

"دراصل آج میں خودکشی کے ارادے سے اس عمارت کی چھت کی طرف جا رہا تھا۔ مگر آپ فکر نہ کریں، چابیاں ڈھونڈنے کے بعد بھی تو یہ کام ہو سکتا ہے۔ چند گھنٹے کی دیر سہی مگر خدا کرے، آپ کے گھر کی چابیاں شام پڑنے سے پہلے پہلے مل جائیں۔ کیونکہ میرے خیال میں خودکشی کے لئے شام کا وقت مناسب نہیں۔ کیونکہ شام تو تنہائی اور اداسی کی لذت لینے کا وقت ہے۔ بچھڑے ہوئے لوگوں کی یاد کا وقت ہے۔ نئی یادیں سنبھالنے کا وقت ہے۔" وہ غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بھی اس کے گمے ہوئے چابیوں کے گچھے میں لگی ہوئی کوئی چابی ہے۔

وہ تیزی سے نظریں گھما گھما کر سڑک پر پڑی ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ بعض چیزوں کو پاؤں سے ایک طرف ہٹا کر دیکھتا اور بعض چیزوں کو صرف پاؤں سے ٹٹول کر آگے بڑھ جاتا۔ گتے کے پرانے اور پھٹے ہوئے ڈبے، جن میں کچھ بچوں کے گرائپ واٹر رکھنے والے ڈبے اور کچھ نزلے، کھانسی اور زکام کی دوائیوں کے ڈبے بھی تھے۔ کپڑوں کے ٹکڑے، پھٹے ہوئے کاغذ اور لفافے، اخبار۔ وہ ہر چیز ادھر ادھر کر کے چابیاں

کا گچھا ڈھونڈ رہا تھا۔

اچانک اسے لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"تم خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"اپنے لئے"۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی..... اس نے اداس نظروں سے اسے ہنستے ہوئے دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔ اسے یوں لگا جیسے چابیوں کے گچھے سے ایک چابی نیچے گر گئی ہے۔

"کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟"

ہاں ——— شہر میں بھیڑ بہت ہے۔

اور وہ بھی دنیا جہاں کی چیزیں سنبھال کر رکھتی ہے.... مگر میری باتیں کہیں رکھ کر بھول جاتی ہے۔"

وہ پورے دل سے ہنسی..... "وہ ہے کون؟"

"پتہ نہیں، بس مجھے کچھ دن اس کی آنکھوں میں بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یوں سمجھو اس کی آنکھوں میں سوالوں کے ڈھیر پہ پڑا میں بھی ایک سوال تھا۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ مگر اب اس کی مسکراہٹ ہلکی سی اداسی میں لپٹی ہوئی تھی.... یکدم یوں لگا جیسے چابیوں کے گچھے میں سے ایک اور چابی نیچے گر گئی ہے۔

دونوں پھر سے چابیاں تلاش کرنے لگے۔ کچھ دور تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک پہ ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ چوک پہ پہنچ کر لڑکی نے پوچھا۔

"خودکشی کے لئے کوئی معقول وجہ ہونی چاہیئے۔"

اس نے سڑک پہ پڑے ایک ربڑ کے ٹکڑے کو ٹھوکر ماری اور کہا۔

"انہوں نے ہمارا جینا حرام کردیا ہے۔

وہ پھر ہنسی اور اس کی بات کا جواب دیئے بغیر چابی ڈھونڈنے میں مصروف ہوگئی۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اور سڑک پر گاڑیوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے میں وہ دونوں چابیاں تلاش کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ اچانک وہ ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ تو اس شخص نے غصے سے بھری آواز میں کہا۔ "نظر نہیں آتا۔ اندھے ہو گیا؟" اور پھر غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"معاف کرنا مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ نابینا ہیں۔"

لڑکی نے چونک کر کہا۔

"میری طرح تم بھی..... ؟"

اور پھر آگے بڑھ کر اسے یوں ٹٹولنے لگی۔ جیسے اسے چابیوں کا گچھا مل گیا تھا۔

کوٹ سے ٹوٹ گِرا ہوا بٹن

بہت عرصہ پہلے میں نے اس بوڑھے کو رات کے وقت ایک دفتر کے کمروں کے تالے چیک کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی شخصیت میں عجیب طرح کی دل کشی تھی۔ ویسے تو وہ صرف اس دفتر کا چوکیدار تھا۔ مگر اس کی باتوں سے یوں لگتا تھا جیسے وہ سارے شہر کا چوکیدار تھا۔ میں نے اسے کریدا تو معلوم ہوا کہ وہ "ماشکی" تھا۔ مگر شہر کے واٹر سپلائی کے جدید نظام نے اسے بے کار کر دیا تھا۔ تب میں نے سوچا کہ اس پر ایک کہانی لکھوں گا۔ بلکہ میں نے اس پر کہانی لکھنے کے لئے کئی شامیں اس کے ساتھ گزاریں اور بہت سا مواد بھی اکٹھا کر لیا۔ مگر انہی دنوں ایک "ترکھان" کی دوکان پہ تابوت بنوانے کے لئے آئے ہوئے کچھ لوگوں سے میری ملاقات ہو گئی تو میں نے اپنا ناول "تابوت" لکھنا شروع کر دیا اور "بہشتی" کی کہانی بیچ میں ہی رہ گئی۔ اس کے بعد میں نے کئی کہانیاں لکھیں اور اپنے کرداروں کے ساتھ اداسی اور تنہائی کے جنگل میں کئی راتیں کاٹیں۔ بوڑھا بہشتی بھی ہمارے ساتھ تھا اور ہمیں پانی پلایا کرتا تھا۔

ایک دن میں نے محسوس کیا کہ میرے باقی سب کردار تو میری کہانیاں اوڑھ کر رخصت ہو گئے ہیں اور بہشتی اکیلا رہ گیا ہے۔ میں نے اس پر کہانی لکھنے کی ابتدا کی مگر پھر بیچ ایک اور کہانی آ گئی۔ جس کا مرکزی کردار وہ لڑکی تھی جو اپنی ماں کے ساتھ اپنے

جہیز کے لئے خریداری کر کے گاؤں لوٹ رہی تھی۔ کہ بس کے حادثے میں مہندی کی بجائے اپنے ہاتھوں پر خون سجا کر رخصت ہوگئی۔۔۔۔۔ میں اس لڑکی کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ جب اس لڑکی کی کہانی مکمل ہوگئی تو میں ایک رات بہشتی سے ملنے گیا اور واپسی پر اس کی کہانی مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر دوسرے ہی دن ایک مالی کی خودکشی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور میں ایک عرصہ تک اس کی کہانی مکمل کرنے کے لئے پھولوں اور تتلیوں کی اقسام اور مزاج کے مطالعہ میں مصروف رہا۔۔۔۔ مالی کے گھر جاتا رہا۔ اس کی ماں سے ملا۔ وہ کوٹھڑی بھی دیکھی جو خشک پھولوں سے بھری ہوئی تھی اور آخر مالی کی کہانی مکمل کر لی۔ مگر اسی دن بوڑھے بہشتی کی کہانی نے پھر مجھے اپنی طرف کھینچا اور میں اسے لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ اس شام کا واقعہ ہے جب ایک شام نے چڑیا کو چگ لیا تھا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے کھڑکی پر بیٹھی ہوئی چڑیا مجھ سے کہہ رہی ہے اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ فلاں باغ میں ایک لڑکا اور لڑکی اداس بیٹھے ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی ایک آج رات خودکشی کرے گا۔۔۔۔ جاؤ اور انہیں روکو۔۔۔۔ میں اٹھ کر اس طرف چل پڑا اور وہ کہانی بھی مکمل کر لی۔ مگر ابھی میں بوڑھے بہشتی کی کہانی شروع بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک بچی کی گڑیا گم ہو گئی اور میں اس کے ساتھ اس کی گڑیا ڈھونڈنے چل پڑا۔۔۔۔۔ اسی دوران میں اس بوڑھے سے بھی ملا جو بچپن میں اپنے گاؤں کی لڑکی کی شادی پر پیسے لوٹتے لوٹتے خود لٹ گیا تھا۔ انہی دنوں میری اس لڑکی سے بھی ملاقات ہوئی جو اپنی باتوں میں زہر گھول کر پلا دیتی تھی۔ مگر ایک دن پھر بہشتی کی کہانی کا خیال مجھے کھینچ کر بہشتی کے گھر لے گیا۔۔۔۔ جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے بہشتی بابا کی کھانسی کی آواز کی بجائے ایک لمبی چپ نے مجھے ڈرا دیا۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔ بہشتی بابا کئی دن پہلے اپنی آخری منزل کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔۔۔۔ گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ ایک کمرے میں وہ جوتے مرمت کرنے والا رہ رہا تھا۔ جس سے بہشتی بابا کرایہ وصول نہیں کرتا تھا۔ اور دوسرے کمرے میں ایک بوسیدہ

پرانی اور اکڑی ہوئی مشک پڑی تھی۔ چارپائی کے نیچے ایک لوہے کا صندوق پڑا تھا۔ کلی پہ بابا کا وہ پرانا لمبا کوٹ ٹنگا ہوا تھا جو وہ سردیوں میں پہنا کرتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوٹ کی جیبیں کہانیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ کوٹ کے عین نیچے، کوٹ کا ایک ٹوٹا ہوا بٹن گرا پڑا تھا۔ کونے میں بابا کے پرانے جوتے رکھے تھے۔ جن پہ گرد جمی ہوئی تھی۔ چارپائی کے پائے کے قریب بابا کا وضو کرنے والا لوٹا پڑا تھا۔ یکدم مجھے بیٹسی راس کا کمرہ یاد آگیا۔ بیٹسی راس نے امریکہ کا پہلا جھنڈا تیار کیا تھا اور آج بھی امریکیوں نے اس کمرے کو اسی طرح محفوظ کر رکھا ہے حتیٰ کہ وہاں وہ برتن بھی پڑے ہیں جو بیٹسی کے زیر استعمال رہے اور جب میں وہاں گیا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بیٹسی اب بھی وہاں موجود ہے۔

میں نے بابا کے ہمسائے سے کہا..... بابا کا کمرہ اسی طرح رہنے دینا۔ اس کی کسی چیز کو مت چھیڑنا اور اس کا کوٹ بھی کلی پہ ٹنگا رہنے دینا۔ کیونکہ اس کی جیبیں کہانیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بابا کی کہانی کہاں سے شروع کروں۔

اس کے جنازے میں شریک نہ ہو سکنے کے ذکر سے، اس کے کوٹ سے جس کا بٹن ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ اور جس کی جیبیں کہانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

اس وقت سے جب بابا کی محبت ٹوٹ کر بکھر گئی تھی، اس صندوق سے جو چارپائی کے نیچے بند پڑا تھا۔ بابا کے بغیر اپنی کہانیوں کے پیاسے کرداروں سے۔ یا شہر میں واٹر سپلائی کے جدید نظام کے ذکر سے..... یا اپنے کوٹوں سے کہ میں اس دن کے بعد جب بھی انہیں پہنتا ہوں، تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کا کوئی بٹن سلامت نہیں۔

سفر کہانیاں

بنکاک سے پتایا جاتے ہوئے ہوٹل چھوڑنے سے پہلے میں نے ہوٹل کی لابی میں لگے مشہور زمانہ نوٹس بورڈ پہ "جو" کے لیے ایک چھوٹی سی سلپ پن کی۔ "جو میں پتایا جا رہا ہوں دو تین روز میں آجاؤں گا۔" مجھے یقین تھا کہ "جو" میری یہ چٹ پڑھے گا کیونکہ ایک ہی رات پہلے میں نے اور "جو" نے اس نوٹس بورڈ کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی تھی۔ ویسے بھی ہوٹل میں ٹھہرنے والا مہمان اس نوٹس بورڈ کو پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ چاہے وہ کس قدر اجنبی کیوں نہ ہو، اس کے لیے کسی بھی قسم کا پیغام اس بورڈ پہ چسپاں ہو سکتا ہے۔ ملائشیا ہوٹل بنکاک کی لابی میں لگے ہوئے اس نوٹس بورڈ کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ سیاحوں کے لیے لکھی گئی اکثر کتابوں میں اس نوٹس بورڈ کا تذکرہ موجود ہے اور میں نے بھی ہانگ کانگ سے جو کتاب بنکاک کے بارے میں خریدی تھی، اس میں بھی ملائیشیا ہوٹل کے اس نوٹس بورڈ کا ذکر تھا۔ یقیناً جب وہ کتاب لکھی گئی ہو گی تو اس وقت یہ نوٹس بورڈ اپنے جوبن پہ ہو گا۔ مگر اب جب میں جون ۸۶ء میں وہاں پہنچا تو یہ نوٹس بورڈ اپنے ان رنگوں میں نہیں تھا کہ اس پہ شہر کی بیماریوں اور ایشیا کے سیاسی مسائل کے بارے میں بھی معلومات موجود ہوتیں۔ ہاں البتہ باقی سب کچھ وہی تھا جس کا ذکر میں کتاب

میں پڑھ چکا تھا۔ نوٹس بورڈ اب بھی پیغامات اور معلومات سے بھرا ہوا تھا۔ بل نے لاری کے نام ایک بہت بڑا پرچہ لکھ کر اس بورڈ پر فروری میں لگایا تھا۔ جس پر لکھا تھا..... پیاری لاری! ابھی واپس مت جانا میں آج آسٹریلیا جا رہا ہوں۔ تم اداس نہ ہونا میں اگلے مہینے آ جاؤں گا۔ تم نے جو میرے ڈالر دیئے ہیں۔ انہیں خرچ کرو۔ کوئی چھوٹا سا ٹور لے لو..... میں نے سوچا آسٹریلیا سے واپس آکر اپنے ملک واپس جا چکا ہو گا اور لاری بھی چھٹیاں گزار کر یہاں سے چلی گئی ہو گی۔ مگر بل کے آسٹریلیا جانے کا لمحہ لاری کی یاد کی صورت میں اب بھی نوٹس بورڈ پر لٹکا ہوا ہے۔ بورڈ پہ ایک اعلیٰ نسل کے بکاؤ کتے کے بارے میں معلومات بھی درج تھیں، جسے سیکسٹن نے سنگاپور میں ایک امریکی سے خریدا تھا۔ اس کے قریب ہی مسٹر باب کے ہاتھ کا لکھا ہوا فل سکیپ کاغذ اٹکا ہوا تھا۔ جس پر باب نے کسی خوب صورت جزیرے کی سیر کا پروگرام، اخراجات اور اب تک کنفرم کرنے والے خوبصورت ساتھیوں کے نام اور کوائف لکھے تھے۔ اسی کاغذ کے نیچے ہی خالی جگہ پر کچھ نئے دوستوں نے بھی باب کے گروپ کے ساتھ جانے پر رضامندی ظاہر کی تھی اور اپنے ملک کا نام اور اس ہوٹل کا نام لکھ دیا تھا جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ملائیشیا ہوٹل کا یہ بورڈ صرف اسی ہوٹل کے مہمانوں تک محدود نہیں بلکہ پورے بنکاک کے سیاحوں میں مقبول ہے۔ وہاں کچھ بند لفافے بھی لگے ہوئے تھے جن پر دوسرے ہوٹلوں کے مونوگرام تھے ______ نوٹس بورڈ کی ہی ایک اور اطلاع کے مطابق ایک بے پناہ طاقتور نوجوان نے اپنی خوبیاں بیان کرتے ہوئے مزید معلومات کے لیے اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ دیا تھا۔ اسی نوٹس بورڈ کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ مس روزینی کے پاس پوری دنیا کا ایک انتہائی سستا ہوائی ٹکٹ موجود تھا مگر مس روزینی کی یہ شرط تھی کہ وہ یہ ٹکٹ صرف کسی یورپی مرد

کو ہی پہنچے گی۔ یہاں کچھ بوسیدہ اور اڑے ہوئے رنگوں والے کاغذوں پہ ان لوگوں
کے پیغامات بھی لکھے ہوئے تھے جن کے ساتھی بچھڑ چکے تھے۔ ان پیغامات کے
لفظ مٹے مٹے سے تھے اور مشکل سے پڑھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نئی
اور کچھ پرانی خواہشیں بھی نوٹس بورڈ پہ چپکی ہوئی تھیں۔ جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔
البتہ مساج کے بارے میں معلومات بڑی پُراثر اور دلکش تھیں جن میں میری
دلچسپی "اوڈھم" کی باتوں نے کم کر دی جو کاؤنٹر کلرک تھا اور پچھلے بیس سالوں سے
وہاں کام کر رہا تھا۔ وہ بدھ مت سے تعلق رکھتا تھا اور دوست بنتے ہی اپنی بیوی
کا ذکر لے کر بیٹھ گیا تھا جو پارسال مر گئی تھی۔ "اوڈھم" کی تان اپنی بیٹیوں پہ آ کر
ٹوٹتی تھی، جن میں سے ایک یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔

میں جب سے یہاں آیا تھا ہر روز باقاعدگی سے نوٹس بورڈ پہ لگی چٹیں اور
پرچے شروع سے آخر تک پڑھتا تھا۔ مجھے پورا نوٹس بورڈ ازبر ہو گیا تھا اور میں جب
رات گئے ہوٹل واپس آتا تو مجھے دور سے ہی اندازہ ہو جاتا کہ اس دن نوٹس بورڈ پہ
کتنی نئی چٹیں لگی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں اس نوٹس بورڈ کو دیکھ کر مجھے اپنے وزیرآباد کے
سکول کا ویران بورڈ یاد آ گیا۔ اس نوٹس بورڈ کو جو آزادی حاصل تھی، وہ میرے
سکول کے نوٹس بورڈ کو حاصل نہیں تھی۔ اس پہ کبھی کبھی باسکٹ بال کی ٹیم کے لیے
سلیکٹ ہونے والے طالب علموں کے ناموں کی لسٹ لگ جایا کرتی تھی، جس میں ہر بار میرا
نام ریزرو کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ میرے نمبر اچھے ہوتے تھے تو
ماسٹر چینسی کھیل کے معاملہ میں بھی میرا مطالبہ مان لیتے تھے۔ یا پھر میرے سکول کے
نوٹس بورڈ پہ کئی سالوں سے ایک تعویذ لٹکا ہوا تھا جو کسی طالب علم کے گلے سے
گر گیا تھا اور کسی نے وہاں لٹکا دیا تھا۔ مگر اسے کسی نے کلیم نہیں کیا۔ جب میں
پانچویں جماعت میں تھا تو بھی وہ تعویذ وہاں تھا اور جب میٹرک میں میرے ایک...

ہم جماعت کا قیمتی قلم گم ہو گیا تو نوٹس بورڈ پہ جو پرچہ لکھ کر لگایا گیا، تعویذ اس کے بالکل قریب لٹکا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تعویذ نوٹس بورڈ کا حصہ بن چکا تھا، اور اب میرے سوا کسی کو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ایک بار میرا جی چاہا تھا کہ میں اس اُستاد کے خلاف ایک پرچہ نوٹس بورڈ پہ لگا دوں جس نے میرے جغرافیے کے مضمون کے پرچے میں سے صرف اس لیے نمبر کاٹ لیے تھے کہ میں اس سے ٹیوشن نہیں پڑھتا تھا۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا کیونکہ مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بہت ڈر لگتا تھا جو اتنا مارتا تھا کہ چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ یکدم میرا جی چاہا کہ میں اپنے جغرافیے کے ماسٹر کے خلاف پرچہ لکھ کر ملائیشیا ہوٹل کے اس نوٹس بورڈ پہ لگا دوں۔ اس خیال کے آتے ہی میں کافی شاپ میں چلا گیا اور اتنا سکون اور خوشی محسوس کی کہ جیسے برسوں پرانا کوئی قرض اتار دیا ہو۔ تصور ہی تصور میں میں نے وہ پرچہ وہاں لگا دیا اور اب سب لوگ اسے پڑھ رہے تھے۔ واقعی ملائیشیا ہوٹل کا یہ نوٹس بورڈ بڑے تاریخی کردار کا حامل تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی دن وہاں پہ ایک بڑی سی چٹ لگی تھی، جس پہ لکھا تھا "گرے بالوں والے آدمی تنہا رہنا اچھا نہیں ہوتا۔" میں نے جلدی سے وہ چٹ اتار کر جیب میں رکھ لی۔ کاؤنٹر پہ کھڑا اوڈھم مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بولا "مسٹر اسلام اچھا ہوا تمہیں خود ہی پتہ چل گیا۔ یہ چٹ اس لڑکی نے لگائی تھی"۔ اس نے سامنے صوفے پہ بیٹھی پاکستانی سی شکل کی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کہہ رہی تھی اگر تمہیں نہ بھی پتہ چلے تو میں تمہیں بتا دوں۔ اچھا ہوا تمہیں خود ہی پتہ چل گیا اس لیے کہ اس وقت ہوٹل میں گرے بالوں والا تمہارے سوا کوئی نہیں۔ باقی سب کے بال یا تو سنہرے ہیں یا سیاہ اور یا پھر براؤن۔

میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ، کاؤنٹر پہ آگئی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی

میں بولی ،" پاکستان سے آئے ہو۔"

میں نے کہا " ہاں ۔ تم کہاں کی رہنے والی ہو ؟"

کہنے لگی ۔ کیا میری شکل پاکستانی لڑکیوں جیسی نہیں ؟"

میں نے کہا ۔" وہ تو ہے ، مگر تم پاکستانی نہیں ۔"

کہنے لگی ۔ میں تھائی ہوں ۔ لیکن مجھے پاکستانی اچھے لگتے ہیں ۔ پھر اس نے ایک پاکستانی نوجوان کا نام بتایا جو اب مجھے یاد نہیں اور اس کے بارے میں بتایا کہ وہ بنکاک آیا کرتا تھا ۔ پھر اس نے مجھے کچھ گالیاں سنائیں جو اس نوجوان نے اسے سکھائی تھیں ۔ مجھے اس طرح کی گالیاں دینے والے لوگ ویسے ہی اچھے نہیں لگتے ۔ اور عورت کے منہ سے گالیاں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اس لڑکی سے گھن آنے لگی تو میں مسٹر اوڈھم سے معذرت کر کے پاکستانی ریستوران کی تلاش میں چلا گیا کیونکہ میں نے کئی دنوں سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا تھا اور آج ہی مجھے کسی نے ایک پاکستانی ہوٹل کا پتہ بتایا تھا ۔ جس کے قریب ہی ایک اسٹور سے میرے برانڈ کے سگریٹ ملنے کی خوشخبری بھی میں نے سُنی تھی ۔ مجھے بار بار اس پاکستانی نوجوان پر غصہ آ رہا تھا ۔ اور میں دل ہی دل میں شرم محسوس کر رہا تھا کہ اوڈھم کیا سوچ رہا ہوگا ۔ دوسرے دن بورڈ پر ایک نئی چِٹ لگی ہوئی تھی ۔ جس پر لکھا تھا :" میرے پاس جرمن ادیب گنتھر گراس کی کچھ کتابیں ہیں جو کوئی بھی دلچسپی رکھتا ہو ، آدھی قیمت پر خرید سکتا ہے ۔ یہ کتابیں انگریزی میں ہیں ۔"

جب سے میں بنکاک آیا تھا ، میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی ۔ صرف اخباروں پر گزارہ تھا اور بنکاک کے اخبار بھی ایشیا کے دوسرے ممالک کے اخباروں کی طرح کے ہی تھے ۔ جن میں خبریں تو بے شمار تھیں مگر خبر نہیں تھی ۔ ان دنوں وہاں الیکشن ہونے والے تھے ۔ مگر اخبار کے مقابلے میں اوڈھم کی باتوں میں کہیں زیادہ "خبریت"

تھی جو وہ اکثر رات کو اس وقت کرتا تھا جب اس کی ڈیوٹی آف ہونے والی ہوتی تھی۔ وہ اپنے دل کی بیماری کا قصہ شروع کرتا اور بات ہوٹل کی کنجوس مالکن سے ہوتی ہوئی کہیں کی کہیں نکل جاتی۔ نوٹس بورڈ پر گنتھر گراس کی کتابوں کے بارے میں پڑھ کر میں نے سوچا ہو سکتا ہے کوئی یورپی سیاح کوئی ایسی کتاب لایا ہو، جو میرے لیے نئی ہو۔ میں نے جیب میں پڑی ہوئی لانڈری کی رسید نکالی اور اس پر کتابیں بیچنے والے کا پتہ نوٹ کر کے اس کی طرف چل پڑا۔ جب میں لفٹ میں سوار ہوا تو وہاں پہلے سے موجود نوجوان یورپی جوڑے نے مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پھیلا کر مجھے ہیلو کہا۔ اور جتنی دیر میں میں نے ہیلو کہہ کر لانڈری کی رسید پر لکھا کمرہ نمبر ذہن نشین کیا اتنی دیر میں لفٹ نے ایک جھٹکے کے ساتھ رک کر اپنے پٹ کھول دیئے۔ تیسرے فلور کا بورڈ پڑھ کر میں جلدی سے لفٹ سے نکل آیا اور کمرہ تلاش کرکے ابھی ناک ہی کیا تھا کہ وہ نوجوان جوڑا تیزی سے میرے قریب آیا اور نوجوان نے ایک بار پھر ہیلو کہہ کر کمرے کے لاک میں چابی گھمانی شروع کر دی۔

"کیا آپ ہی اس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"ہاں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"میں نے نوٹس بورڈ پر گنتھر گراس کی کتابوں کے بارے میں پڑھا تھا۔"

نوجوان نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور پھر سامنے میز پر پڑی کتابوں کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ یہ ہیں کتابیں۔ جب میں نے کتابیں اٹھا کر دیکھیں تو مجھے مایوسی ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا نوجوان نے لڑکی سے میرا تعارف کرایا۔

میری منگیتر، اور کوئی مشکل اور لمبا سا نام بتایا۔

میں جلدی میں اس کے نام کا مخفف بھی نہ سوچ سکا۔ میں نے انہیں بتایا کہ گنتھر

گراس کی کتابیں دی فلونڈر، ان دی ایگ اینڈ پوئمز، دی میٹنگ اینڈ تلگت اور ہیڈ برتھس آر دی جرمنز آر ڈائنگ آؤٹ میں پڑھ چکا ہوں۔ دو تو میں نے پوری پڑھی ہیں اور دو آدھی پڑھ کر چھوڑ دی تھیں۔ کیونکہ پھر آگے ان میں میری دلچسپی برقرار نہ رہ سکی۔ کیا نہیں گنتھر گراس بہت پسند ہے۔ نوجوان نے پوچھا۔

نہیں، مگر سفر میں کچھ بھی پڑھنے کو مل جائے تو غنیمت ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے آپ کے پاس کوئی ایسی کتاب ہو جو میرے لیے نئی ہو۔ مجھے گراس زیادہ پسند نہیں۔ اس کی تصوری عام روش سے ہٹ کر اور مختلف ضرور ہوتی ہے۔ وہ بہت دور کی کوڑی لاتا ہے۔ اس کی امیجری بھی مختلف ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے اس کی تحریریں بہت زیادہ سبق آموز ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مجھے بچپن میں بھی سبق آموز کہانیوں سے چڑ تھی۔ گراس نہ چاہتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر نتیجہ نکالنے کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ اس کا سٹائل اس کی سوچ کو اور سوچ اس کے سٹائل کو دبانے کی کوشش میں مبتلا رہتے ہیں۔

میری بات سن کر نوجوان نے مسکرا کر اپنی منگیتر کی طرف دیکھا اور بولا۔ میں تو ایسی کتابیں نہیں پڑھتا نہ ہی مجھے ایسے مصنفوں سے دلچسپی ہے۔ یہ کتابیں اس کی ہیں اس نے پھر اپنی منگیتر کا کوئی لمبا سا نام لیا۔ میں نے سوچا کہ اسے مشورہ دوں کہ اپنی منگیتر کا نام کچھ مختصر کر لے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے مفید مشورہ اپنے دل میں ہی محفوظ کر لیا۔

نوجوان نے اپنی نیکر کی جیب سے سگریٹ کا ایک چڑمڑ پیکٹ نکالا جو اس کی نیکر سے بھی زیادہ پرانا، میلا اور پسینے کا مارا ہوا لگ رہا تھا۔ پیکٹ میں انگلی گھما کر اس نے اس میں سے ایک ادھ موا سا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ میرے ہاتھ میں جلتے ہوئے سگریٹ پر ایک نگاہ ڈالی اور ایش ٹرے اٹھا کر اپنے اور میرے درمیان رکھتے ہوئے

بولا۔ یہ کتابیں اسے بھی پسند نہیں آئیں۔ اس نے اپنی منگیتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ اسے زیادہ تر اٹالین مصنف پسند ہیں۔ کیونکہ وہ خود اٹلی کی رہنے والی ہے اور آج کل فرانس میں رہائش پذیر ہے جہاں اس کا باپ ایک اشاعتی ادارے میں کام کرتا ہے۔ اسے فرانسیسی زبان پر بھی عبور حاصل ہے بلکہ وہ بہت اچھا شاعر بھی ہے۔ اس کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور پھر یکدم بات بدل کر بولا۔

"کیا تم ملائیشیا کے رہنے والے ہو؟"

میں نے کہا: "میں پاکستانی ہوں۔"

لڑکی یکدم بولی۔ اوہ کیا خوب صورت ملک ہے۔ میری ایک دوست کچھ سال پہلے چھٹیاں گزارنے وہاں گئی تھی۔ اس نے جو کچھ پاکستان کے بارے میں بتایا وہ بڑا دلچسپ تھا۔ پھر اپنے منگیتر کی طرف متوجہ ہوئی۔ آروی ہم شادی کے بعد پہلی چھٹیاں پاکستان میں گزاریں گے۔ نوجوان نے مسکرا کر ہاں میں سر ہلایا۔ لڑکی نے بھی اپنی نیکر کی جیب میں سے اپنے منگیتر کے سگریٹ کے پیکٹ کی حالت سے ملتا جلتا سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے سگریٹ والے ہاتھ کو کتابوں کی طرف جھکاتے ہوتے بولی۔ "ہیڈ بریقس آروی جرمنز ڈاٹنگ آؤٹ" مجھے اچھی لگی ہے۔ یہ کتاب گراس نے چین سے واپسی پر لکھی تھی۔ اچھا تجزیہ ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی تحریر خشک ہو جاتی ہے۔ وہ فلسفے اور نظریے کا بھوت سوار کر لیتا ہے۔ میں اتنی زیادہ خشک تحریریں نہیں پڑھتی۔ سارا دن کمپیوٹر پر کام کرتی ہوں۔ اس لیے اس کے بعد بھی حسابی کتابی تحریریں بوجھل لگتی ہیں۔ آروی کو تو لٹریچر سے بالکل دلچسپی نہیں۔ اس نے اپنے منگیتر کی طرف دیکھا۔ بس یہی ایک بات ہے جو ہم دونوں میں مشترک نہیں۔

آروی نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے پیار بھری نظروں سے اپنی منگیتر کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ جس حد تک تمہیں لٹریچر سے دلچسپی ہے اس حد تک تو

مجھے بھی ہے۔ پھر وہ دونوں بیک وقت مسکرائے۔ ان دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ معاملہ ابھی نیا نیا ہے اور پاکستانی قسم کا ہے۔ ابھی ان دونوں کو وہ باتیں محسوس نہیں ہو رہیں جو ان میں مشترک نہیں۔ وہ دونوں جوانی سے بھرے ہوئے تھے اور بالکل ان تازہ پھلوں کی طرح لگ رہے تھے جو تیز آندھی میں بیک وقت ٹوٹ کر درخت کے نیچے ساتھ ساتھ گر پڑتے ہیں۔ آدھے صاف، آدھے مٹی سے بھرے ہوئے۔ جوانی کی مہک کو ان کے جسموں اور لباس پہ جمی میل کی بُو بھی نہیں دبا سکی تھی۔

آر وی نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی کہنے لگا۔ ایک ماہ پہلے ہم فرانس سے چلے تھے۔ اپنی منگنی کے تیسرے روز۔ ہم نے سوچا کچھ سیر کریں۔ اپنے آپ کو سمجھیں۔

اس کی منگیتر بولی۔ میں نے تو آر وی کو منگنی سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ آر وی تھوڑا سا شرما کر ہنسا مگر اس کی منگیتر نے بات جاری رکھی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی لڑکا کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے یا نہیں، لڑکی کو چاہیے کہ یہ بات نوٹ کرے کہ لڑکا اپنا تولیہ کہاں اور کیسے رکھتا ہے۔ اگر لڑکا لڑکی کے تولیے کے قریب اسی انداز سے اپنا تولیہ رکھ دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکا اس لڑکی کی محبت میں پاگل ہو رہا ہے۔ تمہارا کیا مطلب ہے میں پاگل ہوں۔ آر وی نے از راہِ مذاق کہا۔

وہ اپنی خوشی سے بے قرار آنکھیں سنبھالتے ہوئے بولی۔ جب ہم ساحل سمندر پہ گئے تو میں نے نوٹ کیا کہ آر وی نے اپنا تولیہ میرے تولیے کے بالکل قریب رکھ دیا اسی پوزیشن میں جس پوزیشن میں میرا تولیہ پڑا تھا۔

آر وی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور بولا۔ اب تم پارک کی بات بھی سناؤ گی۔

وہ اپنے منگیتر کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ کیوں نہیں، میں وہ بھی ضرور سناؤں گی۔ اس کے منگیتر نے سگریٹ کا ایک مختصر کش لیا اور بولا۔ او کے۔

تب وہ ایش ٹرے میں سگریٹ بجھاتے ہوئے بولی۔ کسی نے بتایا تھا کہ جب میں اور آروی باغ میں جائیں اور کسی بنچ پہ بیٹھے ہوں تو اگر آروی بنچ کی پشت کے گرد اپنے بازو لپیٹ دے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ یاد ہے آروی تم نے بالکل ایسا ہی کیا تھا۔

میں نے دیکھا آروی کی آنکھیں بے پناہ محبت سے چمک اٹھی تھیں۔ لڑکی کا چہرہ بھی آہستہ آہستہ لو دینے لگا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ہوٹل کی لابی میں آکر بس کا انتظار کرنے لگا۔

اس دن جب میں بنکاک سے پتایا پہنچا تو دن ابھی ڈھلا نہیں تھا۔ بروشر میں میں نے پتایا کے بارے میں جو تفصیلات پڑھی تھیں ان کے مطابق پتایا کو جاگنے میں ابھی بڑا وقت پڑا تھا۔ کیونکہ ساحل سمندر پہ یہ چھوٹا سا شہر دن کو لمبی تان کر سوتا ہے اور رات گئے جاگتا ہے۔ میں نے سامان ہوٹل میں رکھا اور ساحل سمندر پہ آگیا۔ ریت پہ دور دور تک کرسیاں بچھی تھیں اور زندگی جوڑا جوڑا ہو کر بکھر رہی تھی۔ ریت پہ ان کے قدموں کے نشانات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ایک کنوپی کے نیچے پڑی اکیلی کرسی مجھے اپنی طرح تنہا اور اداس لگی تو میں اس پہ بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ تنہائی کا کوئی ایک وطن نہیں ہوتا۔ تنہائی تو انسان اپنے حصے کی آگ کی طرح اپنے ساتھ اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے اور تنہائی کا تعلق شہر کی رونق سے نہیں، من کی رونق سے ہوتا ہے۔

سمندر کی لہریں بپھری ہوئی تھیں، یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کسی بچے کی طرح منہ میں پانی بھر بھر کر دوسروں پہ پھینک رہا ہے۔ دور سمندر میں کھڑے جہاز ان

ریٹائرڈ بوڑھوں کی طرح لگ رہے تھے جو سرِ شام اپنی چھڑیاں لیے سیر کے لیے نکلتے ہیں تو انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وقت ہمارے سامنے چہل قدمی کر رہا ہے۔ وہ جہاز کیا ننھے دفت تھا جو سمندر پہ ہچکولے کھا رہا تھا۔ کشتیاں کرائے پہ دینے والے تھائی خاندان کشتیوں کے سرہانے بیٹھے تھے اور ایک دوسری کے ساتھ جُڑ کر کھڑی کشتیاں تھک کر بیٹھی ہوئی بھیڑوں کی طرح لگ رہی تھیں جن کے سرہانے ملّاح چرواہوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے اور ان کشتیوں کو دیکھ رہے تھے جو دُور بل کھاتے سمندر پہ بھاگ رہی تھیں اور سمندر میں سر چھپاتے سورج کی کرنوں میں کنگھیوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

اتنے میں ایک تھائی لڑکی میرے قریب آئی اور اپنا تھیلا کندھے سے اتار کر ریت پر بیٹھ گئی۔ اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی: "کیا تم اکیلے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں میں اکیلا ہوں۔"

کہنے لگی۔ "یہاں آکر بھی تم تنہا ہو۔ یہاں تو لوگ تنہائی دور کرنے آتے ہیں؟"

میں نے اس کی بات ٹالنے کے لیے کہا "مجھے تنہائی اچھی لگتی ہے۔"

وہ مسکرائی۔ "اپنے ملک میں جاکر تم جب کسی کو یہ بتاؤ گے کہ بنکاک میں بھی تم اکیلے اور تنہا رہے تو کوئی بھی تمہاری بات پر یقین نہیں کرے گا۔"

"یہ سب کسی کو یقین دلانے کے لیے نہیں بلکہ میرا مزاج ہی ایسا ہے۔ میں بنیادی طور پہ ایک تنہا آدمی ہوں۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لاؤ میں تمہارے ناخن کاٹ دوں۔ مسافرت میں بڑھے ہوئے ناخن اچھے نہیں ہوتے۔" اس نے اپنے تھیلے کی زپ کھولتے ہوئے کہا۔ "تھوڑے پیسے دے دینا میرا یہی کام ہے۔ میں دن بھر یہاں ساحلِ سمندر پہ سیاحوں کے ناخن کاٹتی ہوں۔" اس نے تھیلے سے نیل کٹر نکال لیا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر میرا ہاتھ کھینچ

کر بڑی مہارت سے ناخن کاٹنے شروع کر دیئے۔

میں نے اس سے پوچھا: "تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟"

"کشتیوں کی رکھوالی۔"

"رات کو سمندر کشتیوں کے رسے تڑواتا ہوگا؟"

"ہاں، بہت زور مارتا ہے۔"

"اس وقت تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟"

"وہ سمندر کو سمجھاتا ہے۔"

"کیا سمندر تمہارے باپ کی بات مان لیتا ہے۔"

"ہاں، وہ یہاں کا پرانا بوڑھا ہے۔ اس نے اپنی پوری زندگی سمندر میں گزاری ہے۔ سمندر سے اس کی دوستی بہت پرانی ہے۔ جب وہ ابھی بچہ ہی تھا تو اس کا باپ مچھلیاں پکڑنے کے لیے جاتے وقت اسے اپنے ساتھ لے لیتا وہ تب سے سمندر کو جانتا ہے۔ اس کی رگ رگ کو پہچانتا ہے۔ جب سمندر ناراض ہو جاتا ہے اور غصہ سے پھنکارتا ہے تو تمہارا باپ اسے کیسے مناتا ہے۔ اس وقت میرا باپ سمندر کے لیے نیند کی دعا کرتا ہے۔ سمندر کو پرانی مذہبی لوری سناتا ہے۔"

"اس وقت تم کہاں ہوتی ہو؟"

"میں بھی وہ لوری سنتی ہوں۔"

"کیا کشتیاں بھی وہ لوری سنتی ہیں؟"

"کشتیوں کو تو نیند آجاتی ہے مگر میں پھر بھی جاگتی رہتی ہوں۔ جب سے وہ مجھے چھوڑ کر گیا ہے میری نیند بھی ساتھ لے گیا ہے۔ رات بھر جب میرا باپ کھانستا ہے تو اس کی کھانسی میں میری اجڑی ہوئی نیند بولتی ہے۔"

"اور سمندر"

"سمندر بالکل اسی طرح کروٹیں بدلتا ہے۔ جس طرح وہ رات کو کروٹیں بدلتا تھا۔"

"کیا وہ تمہارا شوہر تھا؟"

"ہاں وہ میرا شوہر تھا، مگر میں اس کی بیوی نہیں تھی۔"

"وہ کیسے؟"

"ہاں ہاں وہ اب بھی میرا شوہر ہے مگر اس کی بیوی میں نہیں کوئی اور عورت ہے۔" اس نے ناخن کاٹتے ہوئے ہاتھ روک لیا اور تھیلے میں سے ایک خط نکال کر مجھے دکھایا۔

"میں یہ زبان نہیں پڑھ سکتا۔" میں نے خط پر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

"اس میں لکھا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے اور اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس میں اس نے اس عورت کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں، جس کے ساتھ وہ جا رہا ہے۔"

"کون سی خوبیاں ہیں وہ؟" میں نے پوچھا۔ "کیا وہ تم سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"خوب صورتی تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ کیا تم نے یہاں یورپی اور امریکی مردوں کو دیکھا ہے، کس قسم کی عورتوں کے ساتھ گھومتے ہیں وہ؟"

"ہاں واقعی، مجھے حیرت ہوئی ہے۔"

اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، اب تم یہ سن کر بھی حیران ہو گے کہ میں سیاحوں کے ناخن کاٹ کر روزی کماتی ہوں، مگر اپنا جسم نہیں بیچتی۔"

وہ آبدیدہ ہو گئی تو میں نے بات کا رُخ پلٹنے کے لیے کہا۔

"تم جو اتنے ناخن کاٹتی ہو تو شام تک ناخنوں کا ڈھیر لگ جاتا ہو گا، تو کیا یہ ناخن کشتیوں کو چبھتے نہیں، وہ کیسے تیرتی ہیں؟"

"کشتیوں کو ہی نہیں، سمندر کو بھی اس بات سے چڑ ہے کہ اس کے کنارے ناخنوں

کا ڈھیر لگ جائے۔"

"کیا تم نے کبھی سمندر کے ناخن کاٹے ہیں؟"

وہ مسکرائی۔" بڑا ضدی ہے کٹواتا ہی نہیں۔" اس نے تھیلے کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔" تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا" میرے وطن میں بھی سمندر ہے۔"

"کیا وہ بھی ایسا ہی ہے؟"

"بالکل ایسا مگر اس کا ساحل ایسا نہیں۔"

تب اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

میں نے بھات نکال کر اس کی طرف بڑھائے اور اس نے نوٹ دوہرے کر کے اپنے تھیلے کی زپ کھولی اور اس میں ڈال کر زپ پھر سے بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اندھیرا سمندر کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا اور یہ سرگوشیاں ناخن کاٹنے کی آواز جیسی تھیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے اس سے یہ تو پوچھا نہیں کہ کیا وہ "اس" کے ناخن بھی کاٹتی تھی یا نہیں۔ میں بے چین ہو کر کرسی سے اٹھ گیا۔ معاً میری نظر اس خط پر پڑی۔ وہ "اس" کا خط یہیں بھول کر چلی گئی تھی۔

میں نے خط اٹھا لیا اور کچھ دیر تک اس پہ لکھے لفظوں کو دیکھتا رہا اور پھر جھک کر خط سمندر کے حوالے کر دیا۔

اور اب یہ خط آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خط نہیں، میں سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔

ایک گمشدہ شخص کی تلاش

اس دن عرس کی تقریبات شروع ہوئے پانچواں دن تھا۔ دن تیزی سے ڈھل رہا تھا اور لوگوں کی گنتی پہلے سے زیادہ مشکل ہو گئی تھی۔ انسانوں کے سیلاب سے بچ کر میں مزار کے احاطے کے ایک کونے میں بیٹھا سوچنے اور نہ سوچنے کے عمل میں دل کی دھڑکنیں گن رہا تھا۔ میں صوفی شاعر بابا فرید کے عرس میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا۔ لیکن یہاں آکر پتہ چلا کہ عظیم روحانی شخصیت بابا فرید گنج شکر کا عرس ہی دراصل صوفی شاعر بابا فرید کا عرس ہے اور یہ دونوں شخصیتیں عظمت کی اس منزل پر پہنچ چکی ہیں کہ انہیں الگ الگ کر کے دیکھنا ناممکن ہے چاروں طرف فرید، حق فرید، فرید کی آوازیں گونج رہی تھیں اور لوگ ننگے پیر دھڑکتے دلوں اور دید کی پیاس سے ہلکان، آنکھیں جھپکاتے مزار کے گرد پتنگوں کی طرح منڈلا رہے تھے اور سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنی سی جگہ میں اتنے سارے لوگ کیسے سما گئے ہیں۔

میں نے لوگوں کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی چھوٹے چھوٹے پتنگے لگ رہے تھے جو پولیس کے دباؤ اور انتظامیہ کی رکاوٹوں کے باوجود مزار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور فرید، حق فرید، فرید کی آوازیں مضبوط زنجیر بن کر انہیں مزار کی طرف کھینچ رہی تھیں اتنے میں ڈھول کی آواز نے لوگوں کے دل تھپتھپائے اور ہجوم میں ہلچل پیدا ہو گئی۔

قوالوں نے مزار پر حاضری دی۔ پھر تبرک کے طور پر کوڑیاں پھینکی گئیں۔ لوگ تبرک اٹھانے کے لیے بے قابو ہو گئے۔ پتہ نہیں کس کے ہاتھ کیا لگا اور کون محروم رہ گیا۔ میں بھی ایک کوڑی پر جھپٹا۔ مگر میرے ہاتھ سے وہ کوڑی پولیس کے سپاہی نے چھین لی۔ ابھی میں مایوسی کے عالم میں کھڑا تھا کہ پھر کوڑیاں پھینکی گئیں۔ میں پھر جھپٹا اور ایک کوڑی حاصل کر لی۔ مگر پھر ایک دم میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم نے تو بچپن میں بھی برات کے پیسے نہیں لوٹے تھے۔ مگر آج یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مگر کافی سوچ بچار کے بعد بھی مجھے یہ سمجھ نہ آئی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اور ابھی میں انہی سوچوں میں تھا کہ وہی سپاہی میرے پاس آیا اور کہنے لگا "یہ لو اپنی کوڑی اور پہلے والی کوڑی بھی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

پھر جب بہشتی دروازہ کھلا اور فرید، حق فرید، فرید کی آوازوں سے مزار کا احاطہ لبالب بھر گیا اور چھلکنے لگا تو میں کہیں گم ہو گیا۔ میں نے لوگوں کے ہجوم میں اپنے آپ کو بہت ڈھونڈا اور کئی بار اس شخص سے بھی پوچھا جس نے میرے والا ٹیپ ریکارڈر ایک کندھے پر اور کیمرہ دوسرے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ وہ، وہ نہیں جسے میں سمجھ رہا تھا اور نہ ہی اسے میرے بارے میں معلوم تھا، کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے ایک بار پھر حق فرید، حق فرید، فرید کی آوازوں کے حال میں اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں اتنے لوگ تھے کہ اپنے آپ کو ڈھونڈنا بہت کٹھن تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں تو تنکا ہو گیا ہوں، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میری اتنی قسمت کہاں .... یقیناً میں کسی تنور کے سامنے کھڑا روٹی کو للچائی ہوئی نظروں سے تک رہا ہوں گا۔ یا پھر کسی ہوٹل میں چائے کی پیالی سامنے رکھے ملازمت میں ترقی، یا انکریمنٹ کے بارے میں حساب لگا رہا ہوں گا۔ میرے جی میں آیا کہ میں مزار سے

باہر جا کر بازار میں اپنے آپ کو تلاش کروں لیکن ابھی میں نے ارادہ پکا کیا تھا کہ میرے اندر شور اٹھا۔ فرید، حق فرید، فرید اور پھر یوں لگا جیسے کسی نے یہ شعر پڑھا ہو۔

فریدا سوئی سر دور ڈھونڈ لہو جتھوں لبھے وتھ
چھپڑ ڈھونڈے کیا ملے ، چکڑ ڈوبے ہتھ

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک بار پھر اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں تو کوئی نہ تھا۔ مزار کے صحن میں لوگوں کی بجائے صرف آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ فرید، حق فرید، فرید۔ اتنے سارے لوگ یکدم کہاں گئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ شاید میری طرح وہ سب بھی گم ہو چکے تھے۔ مگر ان کی آوازیں مزار کے بوسے لے رہی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ بھر بھرپور نظروں سے مزار کی طرف دیکھا اور اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے لیے مزار سے باہر آگیا۔

اب میں کئی سالوں سے جگہ جگہ اپنے آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ مگر پتہ نہیں میں کہاں ہوں۔

مائی ہیر سے مُلاقات' جہاں میاں رانجھا بھی تھا

کوئی دو تین سال ادھر واشنگٹن میں میری ملاقات لارسیہ سے ہوئی تو مجھے بے اختیار وارث شاہ کے وہ شعر یاد آ گئے جو اس نے ہیر کا ناک نقشہ بیان کرتے ہوئے کہے تھے.

نین نرگسی مست ممولڑے دے گلاں ٹہکیاں پھل گلاب دا جے
بھواں وانگ کمان لاہور دس کوئی حسن نہ انت حساب دا جے
ہونٹھ سُرخ یاقوت جیوں لعل چمکن ٹھوڈی سیب ولایتی سار وچوں
دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانے نکلے حُسن انار وچوں
عشق بولدا نڈھی دے تھاؤں تھائیں اگ نکلے زیل دی تار وچوں
کتھے آن لگن جیہڑے بھور عاشق نکل جان تلوار دی دھار وچوں
نک الف حسینی دا پپلا اے، زلف ناگ خزانے دی بار وچوں
گردن کونج دی انگلیاں رواں پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں

شعر گنگناتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ "لارسیہ تم ہیر کو جانتی ہو؟" لارسیہ کچھ دیر تک تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر بولی. "کچھ دنوں سے پاکستان کے فوک لور پر جو بحثیں ہو رہی ہیں اور جو گیت

میں نے سُنے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہیر پاکستان کی رومانی داستانوں کا کوئی کردار ہے۔" لاریسہ رومانیہ کی لڑکی ہے لیکن اب کئی سالوں سے امریکہ میں رہتی ہے۔ لاریسہ نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ شاعر ہے اور اسے اپنی شاعری کی وجہ سے رومانیہ چھوڑنا پڑا۔

لاریسہ کا خیال مجھے یوں آیا کہ کچھ دن پہلے مجھے ہیر کے مزار پہ جانے کا اتفاق ہوا۔ جھنگ شہر سے لائلپور کی طرف جانے والی سڑک پہ جھنگ کے بیرونی حصہ میں ایک قبرستان میں ہیر کا مزار ہے اور اس پہ لکھا ہے " عاشق صادق میاں رانجھا اور مائی ہیر یہاں مدفون ہیں "۔ لیکن جب میں مزار کے اندر داخل ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں مائی ہیر کی بجائے کسی اور کے مزار پہ آگیا ہوں۔ اگر میں باہر لکھی ہوئی عبارت نہ پڑھ چکا ہوتا تو یکدم واپس آجاتا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا دو عورتیں ہاتھ اٹھائے کھڑی تھیں۔ ایک شخص ہاتھ پیچھے باندھے آنکھیں جھپکائے بغیر قبر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک نوجوان جو رکھوالا معلوم ہوتا تھا، مزار پہ آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ،" عورتیں یہاں کس قسم کی منت مانگتی ہیں۔ بچے کے لیے، صحت یابی کے لیے، شوہر کی محبت کے لیے؟ نوجوان نے قبر کے سرہانے چھوٹی چھوٹی کجیوں میں پڑی گندم کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔" ہر طرح کی۔ جو چاہے منت مان لیتی ہیں۔" " یہ گندم کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

" عورتیں مزار پہ حاضری دینے آتی ہیں تو گندم لاتی ہیں "

"کس لیے؟"

"چڑیوں کے لیے۔ ہم یہ گندم چڑیوں کو ڈال دیتے ہیں۔"

پھر یکدم میری نظر مزار کی چھت کی طرف گئی۔ لیکن اوپر نیلا آسمان نظر آرہا تھا۔ میں نے نوجوان سے پوچھا۔" مزار کی چھت کیوں نہیں؟" بولا۔ کئی بار چھت ڈالی مگر

گر جاتی ہے۔ اس لیے اب ہم ڈالتے ہی نہیں۔" ایک دیہاتی کھیس کی بکل مارے ہمارے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔" چھت نہیں ہے لیکن پھر بھی جتنی مرضی بارش ہو۔ پانی اندر نہیں آتا۔" نوجوان نے قدرے خفگی سے اس شخص کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔"کیوں نہیں آتا پانی۔ یہاں سب پانی بھر جاتا ہے۔" میں نے ایک بار اس نوجوان اور پھر اس دیہاتی کی طرف دیکھا اور الٹے قدموں مزار سے باہر آگیا۔ یکدم مجھے یوں لگا جیسے ہیر مزار کے باہر کھڑی ہے اور میاں رانجھا بھی اس کے ساتھ ہے۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ لیکن وہ چل پڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دور جا کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں اپنے ساتھیوں کے پاس آگیا اور ان سے رازدارانہ لہجے میں کہا:" یار مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہیر کا مزار یہاں نہیں بلکہ کسی اور جگہ ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب ہیر اور رانجھا چھپتے چھپاتے یہاں پہنچے تو انہوں نے زمین سے کہا کہ انہیں چھپا لے اور دونوں زمین کے اندر چلے گئے اس لیے لوگوں نے یہاں ان کا مزار تعمیر کیا۔" محقق کچھ اور کہتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس روایت پر یقین کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے زمین نے ہیر اور رانجھے کو چھپا کر کہیں اور ظاہر کر دیا ہو۔

یکدم میرا دھیان لاریسہ کی طرف چلا گیا جس سے دو تین سال پہلے میں نے واشنگٹن کے نیشنل پارک میں پوچھا تھا۔" لاریسہ تم ہیر کو جانتی ہو۔" اور پھر جب میں نے لاریسہ کو ہیر کی کہانی سنائی تھی تو اس نے کہا تھا یوں لگتا ہے جیسے ہیر پاکستان کی نہیں رومانیہ کی رہنے والی تھی۔ تب میں نے لاریسہ سے بھی کہا تھا کہ ہیر کی کوئی نیشنلیٹی نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پاکستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پہ اس نے ایک نہ ختم ہونے والی کہانی کی ابتداء کی۔ پھر یکدم مجھے قبولے کی وہ "روڑیاں" (گندگی کے ڈھیر) یاد آگئیں جن کے بارے میں روایت ہے کہ جب ہیر اور رانجھا قبولے سے

گزر رہے تھے تو اس وقت کے راجہ عدلی نے انہیں پکڑ لیا اور انہوں نے بددعا دی کہ خدا کرے تیرے شہر کو آگ لگی رہے تو وہاں آگ لگ گئی اور لوگ کہتے ہیں کہ آج تک قبولے میں "رُوڑیاں" آہستہ آہستہ دھواں چھوڑتی رہتی ہیں. سوچتے سوچتے میں نے پھر اپنے ساتھیوں کے چہروں کی طرف دیکھا اور کہا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے رانجھے کی بھی کوئی نیشنیلٹی نہیں تھی۔" سب ہنس پڑے۔ میں پھر سوچ میں پڑ گیا۔ ہوسکتا ہے کبھی ہیر سے ملاقات ہو ہی جائے۔ کیا پتہ وہ داتا گنج بخش ؒ کے مزار پر حاضری دینے آتی ہو یا پھر جھنگ۔ یکدم مجھے یوں لگا جیسے ہیر اب بھی زندہ ہے یا ہوسکتا ہے کہ وہ سوہنی کی طرح اب بھی ہر سال پیدا ہوتی ہو اور پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہو۔ ہوسکتا ہے ہیر کا مزار امریکہ، برطانیہ یا کسی اور ملک میں ہو۔ پھر مجھے لگا جیسے ہیر کا مزار اسلام آباد میں ہے۔ لیکن لاریسہ تو کہتی تھی ہیر رومانیہ کی رہنے والی ہے۔ پھر یہ کہ ہیر تو ابھی مری ہی نہیں تو پھر اس کا مزار کیسا۔ ہیر تو اب بھی کچھ لڑکیوں کے اندر رہتی ہے۔ مگر وہ لڑکیاں کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔ وہ لڑکی تو مجھے چولستان میں ملی تھی یا پھر خانہ بدوش گل پری جس سے میری ملاقات کاغان میں ہوئی تھی۔ لاریسہ یا پھر کوئی اور۔ ہیر کس کے ہاں رہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں ہیر روح ہے اور رانجھا جسم۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہیر ایک سوچ ہو اور رانجھا اس سوچ کا اظہار۔ اور یہ سوچ اپنے اظہار کے لیے ہی دُکھ جھیلتی رہی ہو۔ تو پھر تو ہیر کا مزار دنیا کی کسی جگہ، کسی ملک میں بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ہیر ان میں سے کسی مزار میں بھی نہیں۔ وہ تو اب بھی اپنے اظہار کے لیے تڑپ رہی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ہیر آج کل پھر یہیں کہیں ہے اور اظہار کی راہ کو دیکھ رہی ہے یا پھر کسی اور ملک میں ہے۔ کافی عرصے سے لاریسہ کا بھی کوئی خط نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے اس کی ہیر سے کہیں ملاقات ہوگئی ہو اور وہ بھی میری طرح گہری سوچوں میں گم ہو اور اب یہ سوچ رہی ہو کہ سید اکھیڑا

کون تھا، کیدو کون تھا اور چوچک کون۔ اور وہ تینوں مر گئے ہیں یا ابھی زندہ ہیں۔
اتنے میں ڈھول اور باجوں کی آواز نے میرا پیچھا کیا۔

ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے، بابل اساں اڈ جاناں

میری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ برات دلہن کو لے کر آ رہی تھی۔ کچھ نوجوان جھوم جھوم کر ناچ رہے تھے۔ کہاروں نے ڈولی اٹھا رکھی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہیر اس ڈولی میں ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں ڈولی کا پردہ اٹھا کر دیکھوں۔ لیکن جانے کیوں میں دو قدم اٹھا کر رک گیا اور براتیوں میں سیدے کھیڑے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس نے اپنا چہرہ پھولوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ ہیر اسی ڈولی میں ہے۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے برات آگے بڑھ گئی۔ باجوں کا شور دور چلا گیا اور میں اکیلا رہ گیا۔ اور اب وہیں کھڑا یہ سوچ رہا ہوں۔ اس ڈولی میں ہیر تھی یا کوئی اور۔

مرحوم کے گھر رات کے کھانے پر

چترال سے تھوڑی دور ایک پہاڑی گاؤں ایون ہے۔ دنیا کے کئی محققوں اور سیاحوں نے اپنی کتابوں میں ایون کا ذکر کیا ہے۔ چترال کی تاریخ میں ایون کو بے حد اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایون اسی راستے پر پڑتا ہے جو بمبوریت، بریر اور رمبور وادیوں کی طرف جاتا ہے اور جہاں کیلاش آباد ہیں۔

اس دن پچھلے پہر ہم ایون جا رہے تھے جہاں غلام عمر مرحوم کے بھائی نے ہمیں مرحوم کے ہی گھر رات کے کھانے پر بلایا تھا اور ہم نے یہ دعوت اس لیے قبول کر لی تھی کہ ہمیں یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ دعوت مرحوم کے بھائی کی طرف سے نہیں، بلکہ مرحوم نے خود ہمیں رات کے کھانے پر اپنے گھر بلا بھیجا ہے۔

اونچے اونچے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ بچوں کی کہانیوں کی کتابوں کے جنوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ان پہاڑوں کے قدموں میں چھچھلا مگر کہیں کہیں سے اتھلا اور کہیں سے بہت گہرا دریا، پہاڑوں کے گرد لپٹا ہوا تنگ اور پیچ پیچ راستہ۔ دریا کے اس پار چھوٹی چھوٹی وادیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن میں کہیں کھوار زبان کے بزرگ شاعر بابا ایوب کا گاؤں چمرکن بھی ہے۔

ہم سب چپ تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی بات نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی یوں

لگتا تھا جیسے ہم سب بلند آواز میں مرحوم کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ایک دوسرے کی بات کا جواب دے رہے ہیں۔

آخری بار جب وہ مجھے ملنے اسلام آباد آیا تو سردیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ مگر وہ اس طرح سکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا جیسے پالا اس کی ہڈیوں کو کاٹ رہا ہو۔ میں اس کی کتاب کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ مگر لگ رہا تھا جیسے وہ میری پوری بات نہ سن رہا ہو اور یونہی کہہ رہا ہے کہ" ہاں میں تیری خواہش کے مطابق ترامیم اور اضافے کر کے بھیج دوں گا۔" میں نے اس کے لیے چائے منگوائی تو اس نے بالکل اس طرح چائے پی جیسے کسی اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے گاڑی رکتی ہے تو کوئی مسافر گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم کے کسی ٹی سٹال سے چائے پیتا ہے اور اس کا سارا دھیان گاڑی کی طرف ہوتا ہے۔

وہ جلدی میں تھا۔اس کے اندر موت کا موسم شروع ہو چکا تھا۔مجھے لگا جیسے وہ چیخ روک کر بیٹھا ہو اور بار بار اپنی چیخ کو مسکراہٹ میں ڈھال لیتا ہے۔میں نے اس کی کتاب کے لیے کچھ نئے باب تجویز کیے۔اس نے مسودہ میز پر سے اٹھا لیا اور اسے بغل میں دبا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔اور بولا۔" بالکل ایسے ہی ہو جائے گا۔تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔میں اب چلتا ہوں۔جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس قدر جلدی میں ہے کہ اس کے پاس لباس تبدیل کرنے کا بھی وقت نہیں۔اس کا لباس بھی میلا تھا۔اس کے جوتے بھی تھکن سے چُور چُور تھے۔اور سگریٹ پینے کا انداز بالکل اس شخص جیسا تھا جسے سگریٹ پینے کا مزا نہیں آ رہا ہوتا مگر وہ صرف عادتاً سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جاتا ہے۔اس نے اوین پہنچتے ہی مجھے خط لکھنے کا وعدہ کیا اور تیزی سے میرے کمرے سے نکل گیا۔

مگر پھر جب سردیاں عروج پر تھیں اور مجھے اس کے خط کا انتظار تھا۔تو ایک دن

اس کی موت کی اطلاع ملی۔ اور اب کوئی ڈیڑھ دو سال بعد ہم اس کے گھر جا رہے تھے تو پھر سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ آج اس نے ہمیں رات کے کھانے پہ بُلایا تھا اور اپنے بھائی کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ ایون کے راستہ میں ہی اس کی قبر ہے بالکل سڑک کے کنارے۔

جب ہم اس کی قبر کے پاس پہنچے تو ابھی پوری طرح شام نہیں ہوئی تھی۔ جیپ سے اترتے ہی یوں لگا جیسے وہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ پھر جب ہم اس کی قبر پہ فاتحہ پڑھ چکے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ میرے بیوی بچے کھانے پہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔

وہاں سے ہم کوئی فرلانگ بھر آگے گئے ہوں گے کہ مرحوم کے گھر کے قریب مرحوم کا بیٹا لالٹین لیے ہمارا منتظر تھا۔ ہم نے ایک چھوٹا سا نالہ پار کیا اور نیچے اترنے لگے۔ جہاں ڈھلوان اترتے ہی مرحوم کا گھر تھا۔ برآمدے میں چارپائیاں بچھی تھیں اور صحن انگور کی بیلوں اور درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف میز پہ مرحوم کی کتابیں اور مسوّدے ترتیب وار پڑے تھے جو مرحوم کے بھائی نے ہمارے دیکھنے کے لیے رکھے تھے۔ جن میں فارسی کی پرانی کتابیں، تذکرے، چترال کی تاریخ اور کھوار کے علاوہ اردو کی بہت سی کتابیں بھی تھیں۔ ہم کتنی دیر تک مرحوم کی کتابیں دیکھتے رہے اتنے میں تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی جو صحن میں اُگے درختوں اور بیلوں کے اندر شور مچاتی ہوئی برآمدے کی طرف لپکتی اور پھر کھلے دروازے سے گھر کے اندر داخل ہو جاتی۔ دروازہ زور سے کُھلتا اور پھر زور سے بند ہو جاتا۔ کئی بار تو ایسے لگا جیسے مرحوم نے دروازہ کھولا ہے اور اندر آکر اسے بند کیا ہے اور اب برآمدے میں آکر کونے میں رکھی چارپائی پہ بیٹھ گیا ہے اور ہماری باتیں سن رہا ہے۔

تیز ہوا، لالٹین کی مدہم اور سہمی ہوئی اداس روشنی برآمدے میں بیٹھے ہوئے مرحوم

کے دوست، اور اُداسی۔ بالکل پکے ہوئے اناروں کی طرح جو میں نے کوغذی میں دیکھے تھے۔ ایسی اداسی شاید کافکا کے دل میں اس وقت ہوگی جب اس نے اپنی محبوبہ فیلیس کو آخری خط لکھا تھا۔ یا پھر ایسی اداسی اس وقت ہوگی جب امریکی شاعر ہارٹ کرین نے اپنی محبوبہ کے ساتھ بحری جہاز میں سفر کرتے ہوئے اچانک سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔

ایسی اداسی میں نے اس وقت بھی دیکھی تھی جب احمد شمیم کے دوست اور شہر کے لوگ اس کی قبر پر مٹی اور پھول ڈال کر لوٹ رہے تھے اب میری سمجھ میں آیا کہ مرحوم جب اسلام آباد میرے پاس آیا تھا تو وہ اس قدر جلدی میں کیوں تھا۔ دراصل ان دنوں وہ اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور صحن میں میز پر رکھی مرحوم کی کتابوں کے کچھ ورق اڑا کر لے گیا۔ میں اٹھ کر ان کے پیچھے بھاگا اور انہیں اکٹھا کر کے مرحوم کے بیٹے کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ کتابوں کو لے جا کر الماری میں رکھ دے۔

کتنی دیر تک ہم سب چپ بیٹھے رہے۔ اتنے میں کسی نے مرحوم کی بیماری کی بات چھیڑی تو اس کے بھائی نے بتایا کہ اسے گلے کا کینسر ہو گیا تھا۔ ایک دن ہسپتال میں ڈاکٹر نے یہ سمجھ کر کہ وہ انگریزی نہیں جانتا، کسی کو بتایا کہ اسے کینسر ہے۔ بس اسی دن سے اس نے موت کی تیاری شروع کر دی تھی مگر پھر بھی وہ باقاعدگی سے بچوں کو پڑھانے سکول جاتا رہا۔ یہ بات سن کر جانے کیوں مجھے کافکا یاد آ گیا۔ جس نے اپنی محبوبہ کو ایک خط میں اپنی بیماری (ٹی بی) کے بارے میں لکھا تھا کہ میری ٹی بی کے بارے میں جان کر لوگوں کی مدد کا جذبہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے بچہ ماں کے سکرٹ سے لٹک کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ پھر میں نے سوچا۔ جانے آج اس کی بیوی پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ کیا محسوس کر رہی ہوگی۔ شاید وہ یہ سوچ رہی ہوگی کہ آج اتنی دور سے اس کے دوست

آئے ہیں تو ابھی وہ بھی آجاتے ۔ لیکن کیا معلوم وہ اندر آیا بیٹھا ہو اور اپنی بیوی کو کھانے کے بارے میں ہدایات دے رہا ہو۔ یہ پکاؤ ..... اس برتن میں ڈالو.... ایسے رکھو۔

تیز ہوا برآمدے میں بیٹھے لوگوں کی باتیں اڑا اڑا کر لے جا رہی تھی ، اور ان کی مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ مرحوم کی کہانی بالکل پریوں کی کہانی سے ملتی جلتی تھی۔ وہ اس بچے کی طرح تھا جو کھیلتے کھیلتے اچانک پریوں کے دیس میں جا نکلے ۔

پھر مرحوم کے بیٹے ہمیں ایک کمرے میں لے گئے جہاں بہت سے کھانے سجے ہوتے تھے۔ مرحوم کی پسند کے کھانے ، مرحوم کے دوستوں کی پسند کے کھانے ، سب لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے تو اچانک پیچھے سے کسی نے ہاتھ بڑھا کر ایک ڈش میرے سامنے کر دی ۔ میں نے حیران ہو کر پیچھے دیکھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ڈش دوسری طرف بڑھا دی ۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر کسی نے ڈش میرے سامنے کر دی ۔

لوگ اب مرحوم کی بجائے موسم اور ثقافت کی بات کر رہے تھے ۔ پہاڑی لوگوں کی زندگی اور رسم و رواج پر بات ہو رہی تھی ۔ بیچ میں کچھ باتیں کھانے کے بارے میں بھی ہوئیں اور جب سب آدھے سے زیادہ کھانا کھا چکے تو ان کی باتوں میں اداسی کم ہو گئی اور اطمینان آ گیا ۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ہلکی پھلکی باتوں پر آ گئے اور آخر میں جب وہ قہوہ پی رہے تھے تو صحیح معنوں میں گپ شپ کر رہے تھے ۔ مجھے یوں لگا جیسے ان سب نے موت کے خوف پر قابو پانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں شروع کی ہیں ۔ میں باہر آکر برآمدے میں رکھی ہوئی چار پائی پر بیٹھ گیا ۔ اچانک پیچھے سے کوئی بولا ۔ معاف کرنا میں تمہیں خط نہیں لکھ سکا اور اگر میں تمہیں موت کے بعد خط لکھتا تو سب لوگ حیران ہوتے ، خوف کھاتے ۔ اور ممکن تھا کہ تم بھی میرا خط پڑھے بغیر پھاڑ دیتے ۔

میں نے پیچھے دیکھے بغیر کہا، "میری خواہش ہے کہ تم مجھے خط لکھو۔ مجھے موت کی خوب صورتیوں کے بارے میں بتاؤ۔ اپنے بارے میں لکھو۔ میں تمہارے خط کا انتظار کروں گا۔"

اب اس بات کو تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے مگر ابھی تک مرحوم کا خط نہیں آیا۔ میں ہر روز بڑے اشتیاق سے ڈاک کھولتا ہوں۔ مگر اس میں اس کا خط نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ اب کسی دن مجھے اس کا خط موصول ہو جائے گا..... میں مرحوم کے خط کا منتظر ہوں۔

یہ کتاب کِس کو دُوں؟

میں جب اس سے ملنے کے لیے گیا تو وہ لان میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور چہرہ میری طرف گھما کر بیٹھ گیا، جیسے پوچھ رہا ہو کیسے آئے ہو۔ لیکن میں اس کی شخصیت کے رعب تلے دبا ہوا تھا۔ دراز قد، سرخ و سفید رنگ اور گہری پُرمعنی آنکھیں، لوگوں نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ وہ واقعی ایسا پڑھا لکھا آدمی لگ رہا تھا جس نے علم اپنے اندر سمیٹ لیا تھا اسی لئے اس کی طبیعت میں ایک طرح کا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ مجھے وہ ایسے سکول کی طرح لگا جس کی ساری کلاسیں لگی ہوئی تھیں، اور میں بھی ایک کلاس میں بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں تاریخ کا پیریڈ تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ دراصل میں شنا، بلتی اور بروشسکی زبانوں اور ان کے فوک لور کے بارے میں اس سے گفتگو کرنے کے لیے گیا تھا۔ وہ ان زبانوں اور علاقوں کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا تھا۔ دُنیا بھر کے بڑے بڑے سکالروں اور فوک لور پر کام کرنے والوں نے اپنی کتابوں میں اس کا حوالہ دیا تھا۔ میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کی وہ لائبریری بھی دیکھوں جس کے بارے میں سُنا تھا کہ اس میں بڑی نایاب کتابیں ہیں۔ اور وہ

اپنی کتابوں سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اپنی کتاب کبھی کسی کو نہیں دیتا۔ بلکہ وہ تو کسی کو اپنی لائبریری میں جانے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں آج فلاں فلاں موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ وہ کچھ دیر چپ رہا اور پھر بولا۔ اس گفتگو کے لیے کافی وقت درکار ہے جب وہ یہ بات کر رہا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے گہرے تالاب کی پرسکون سطح پر کوئی لہر اٹھی ہو۔

اتنے میں ملازم چائے لے آیا۔ لیکن اس نے گفتگو جاری رکھی اور ایسی ایسی باتیں بتائیں جو میں نے اس سے پہلے نہ کسی کتاب میں پڑھی تھیں اور نہ کسی سے سنی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ گفتگو کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مطالعہ اور علم کا کوئی دریا بہہ رہا ہے اور میں اس میں ہچکولے کھا رہا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور اس کی لائبریری دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ چپ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی یہ کہہ کر معذرت کرے گا کہ میں کبھی کسی کو اپنی لائبریری میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر جانے اس دن وہ کس موڈ میں تھا۔ "چلیے" کہہ کر وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

چھوٹی سی لائبریری، جس میں کتابوں کے علاوہ شیر کی کھال اور ایک بندوق بھی دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ جب بھی میں کوئی کتاب اٹھاتا وہ جھٹ سے میرے ہاتھ سے کتاب لے لیتا اور خود کتاب کے ورق الٹ الٹ کر مجھے اس کتاب کا نام اور موضوع بتانے لگتا۔ کتابیں اگرچہ بہت کم تھیں مگر واقعی ایسی تھیں جن کا اور کوئی نسخہ شاید ہی اور کسی کے پاس ہو۔ کسی کتاب میں پھٹا ہوا اور بوسیدہ

ورق آجاتا تو وہ اس پر یوں ہاتھ رکھتا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے ماتھے پر آئے ہوئے زخم پر مرہم لگا رہی ہو۔ پھر ایک ایسا لمحہ بھی آیا جب میں نے اس سے ایک کتاب پڑھنے کے لیے مانگ لی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کتاب کو جھولی میں رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا فیصلہ دے گا۔ مجھے وہ ایسے شخص کی طرح لگا جس نے ابھی ابھی کسی بہت بڑے حادثے کی خبر سُنی ہو۔ میں نے اس سے جو کتاب مانگی تھی، وہ گلگت، ہنزہ، سکردو اور چترال کے بارے میں تھی۔ یہ ایک ایسا سفرنامہ تھا، جو پھر شاید کبھی نہ لکھا جا سکے۔ اس نے کتاب کے ورق الٹنے شروع کر دیئے اور میری طرف دیکھے بغیر بولا۔

"میں نے آج تک اپنی کتاب کبھی کسی کو نہیں دی۔ یہ میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ تم یہ کتاب لے جاؤ، لیکن شرط یہ ہے کہ ایک ماہ کے بعد پڑھ کر واپس کر دینا۔"

میں نے فوراً وعدہ کر لیا اور کتاب اس سے لے کر اپنے بیگ میں ڈال لی۔ اس نے مجھ سے رسید لکھوا لی۔

ایک ماہ کے بعد اس نے میرے پاس ایک آدمی بھیجا۔ لیکن بدقسمتی سے میں اپنے دفتر میں موجود نہ تھا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے اس نے ایک خط لکھا کہ میری کتاب کسی کے ہاتھ بھیج دو۔ بذریعہ ڈاک مت بھیجنا تاکہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ میں کچھ عرصہ تلاش میں رہا۔ لیکن مجھے گلگت جانے والا کوئی آدمی ایسا نہیں مِل سکا جو اس کی کتاب باحفاظت اس تک پہنچا سکتا۔

اس بات کو ایک سال گزر گیا۔ ایک دن مجھے گلگت جانا پڑا۔ میں کتاب ساتھ لے گیا اور گلگت پہنچتے ہی کتاب لے کر اس کے گھر پہنچا۔ گھنٹی بجائی، ملازم باہر آیا

تو میں نے اس کا پوچھا۔ ملازم پُرنم آنکھیں لیے چپ کھڑا رہا اور پھر کہنے لگا۔
"آپ کہاں سے آئے ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ آج سے چھ ماہ پہلے صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔"
ملازم کی بات سُن کر مجھے دُکھ اور رنج سے اپنا آپ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔
جب میرے حواس بجا ہوئے تو ملازم اندر جا چکا تھا۔ کتاب میرے ہاتھ میں تھی، میں آہستہ آہستہ واپس چل پڑا۔
آج اس بات کو پھر ایک سال ہونے کو ہے۔ اس کی کتاب اب بھی میرے پاس ہے لیکن میں آج تک یہ طے نہیں کر پایا کہ اس کی یہ کتاب اب کس کو دُوں،

قصّہ مختصر

چڑیا کے پیروں میں اُلجھا ہوا دھاگہ

اسے پرانی چیزیں اچھی لگتی ہیں
وہ پرانے خط اکٹھے کرتا ہے
پرانی کتابیں پڑھتا ہے۔
اس نے بہت سے قدیم نوادرات جمع کر رکھے ہیں، لیکن اپنی جمع کی ہوئی پرانی چیزیں
دکھلانے کے لیے وہ ہر روز ایک نئی لڑکی کو اپنے گھر بلا لیتا ہے۔

سُناٹا

اُسے بچے اچھے لگتے ہیں
وہ بچوں سے بڑی محبت کرتی ہے۔
لیکن جونہی وہ کسی بچے کو پیار کرنے لگتی ہے۔
وہ یکدم بڑا ہو جاتا ہے۔

دُم کا نظریہ

وہ چوہا شربت پینے کا حقدار ہے
جو بڑی مشکل سے الماری میں رکھی بوتل کا ڈھکن کھولتا ہے
اپنی دم بار بار بوتل میں ڈالتا ہے
اور اسے چاٹ لیتا ہے۔

تعارف

کسی نے ان کا تعارف کروایا اور کہا

یہ بہت اچھے آدمی ہیں

ہر کوئی ان سے خوش ہے

کسی بات کا بُرا نہیں مانتے

ہر روز اپنے دوستوں کو بے شمار خطوط لکھتے ہیں

ہر محفل میں شرکت کرتے ہیں

کسی کا دل نہیں توڑتے

مجھے لگا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

پھر مجھے یاد آیا

میں نے ایک ہال میں

بچوں کے بہت سے کھلونے دیکھے تھے

ان میں ایک کاٹھ کا گھوڑا بھی تھا

جو بچہ آتا تھا اپنا سکہ ڈال کر گھوڑے پر سواری کر لیتا تھا

تنگ گلی

جب
آنکھیں ہونٹوں پر اتر آتی ہیں
اور ہونٹ
کبوتروں کی طرح
اُڑکر آنکھوں میں آ بیٹھتے ہیں

اداسی

کالے کپڑے
بھورے بال
کانوں میں بالیاں
آنکھوں میں سوال

پروف ریڈنگ

رات بہت بارش اور آندھی تھی صبح کھڑکی پر اس کی دستک
جمی ہوئی تھی دیوار پر لانگ ڈسٹنس کال چپکی ہوئی تھی
میں پھر بھی گھر پر نہیں تھا

زندگی

زندگی

دھوبن چڑیا ہے

اُجلے پروں کا لباس

پاؤں جوتوں سے بے نیاز

آنکھوں میں بھوری نیلی آس

زبان پر سمندر کی۔ پیاس

مگر میں نے

ہمیشہ اسے اپنی قبر پہ

بیٹھے دیکھا ہے۔

دُعا

اس صبح عدالت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے

اس شام قیدیوں سے باتیں کرتے ہوئے

اس رات الزامات کی فہرست اوڑھ کر سوتے ہوئے

اس نے دُعا کی

اے خدا

میرے شہر کے بچوں کے خوابوں کو

تھانوں اور کچہریوں سے بچا

کوئی اور

پتہ نہیں اس کا ٹیلی فون نمبر کیا ہے ۔ وہ مجھے اکثر فون کرتی ہے

شکوے کرتی ہے کہانیاں سناتی ہے ۔ڈانٹتی ہے اور روٹھ جاتی ہے ۔تب فون ڈسکونیکٹ ہو جاتا ہے مگر وہ دوسری کال کرتی ہے اور جب میں فون اٹھاتا ہوں تو کچھ نہیں بولتی ۔۔میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ اسی کا فون ہے میں اسے منا لیتا ہوں اور وہ مان جاتی ہے ۔

مگر پھر بھی جب وہ کہیں ملتی ہے تو میری طرف یوں دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو میں وہ نہیں جو تمہیں فون کرتی ہے ۔

میں بھی اس کی طرف یوں دیکھتا ہوں جیسے اس سے کہہ رہا ہوں ،جو تمہاری کالیں ریسیو کرتا ہے وہ میں نہیں کوئی اور ہے ۔

سانپ

اکثر شام کو وہ میاں بیوی سیر کے لیے نکلتے تو مرد اپنی چھڑی لینا کبھی نہیں بھولتا

انہیں دیکھ کر میرے دوست نے مجھ سے پوچھا

وہ اپنے ہاتھ میں چھڑی کیوں رکھتا ہے

سانپ وغیرہ مارنے کے لیے ،میں نے کہا

تو پھر اسے مارتا کیوں نہیں ،اس نے حیرت سے پوچھا۔

دوپہر

وہ اس سے محبت کرتی ہے
اس کی تنہائی، اداسی اور دکھ بانٹتی ہے
مگر جب دن کے دو بجتے ہیں
تو بڑی احتیاط سے دن کے کورے کاغذ کے دو حصے کرتی ہے
پہلا حصہ پھاڑ کر اپنی مٹھی میں بھینچتے ہوئے کہتی ہے۔
آج تمہارے ساتھ بہت وقت گزرا
پھر دوسرا حصہ اس کے حوالے کرتے ہوئے
کہتی ہے۔
تمہیں پتہ ہے شام کو میں بہت زیادہ مصروف ہوتی ہوں۔

دل کا دھوپ

اس کی محبوبہ کی باتوں میں دور تک دھوپ ہی دھوپ ہے۔
ایک بھی سایہ دار درخت نہیں
پھر بھی
جب وہ چلی جاتی ہے۔
تو اسے یوں لگتا ہے
جیسے وہ اپنی چھتری کہیں رکھ کر بھول گیا ہے

کچّا رنگ

اسے کچّے گھر اچھے نہیں لگتے
اس کے ارادے بھی بڑے پکّے ہیں۔
وہ عام طور پر پکے رنگوں کے کپڑے پہنتی ہے
لیکن اس کی باتوں کے رنگ بہت کچے ہیں

خوف

وہ اس خوف سے زیادہ نہیں بولتا کہ کہیں اس کی زبان گھس نہ جائے
اور وہ اس خوف سے زیادہ بولتا ہے کہ کہیں اس کی زبان بولنے کی عادت سے
محروم نہ ہو جائے۔

پوسٹ مارٹم

۲۰ سال تک پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد
اب اس نے ریٹائرمنٹ کے لیے درخواست دے دی ہے۔
تو میں سوچتا ہوں
میرا پوسٹ مارٹم کون کرے گا۔

آوٹ آف فوکس

اس کی کھینچی ہوئی تصویروں کی نمائش جاری تھی
ایک لڑکی نے اس کے فن کو سراہتے ہوئے کہا - آپ کی تصویریں بہت اچھی ہیں۔
اس نے لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ مجھے تو لگتا ہے میری ساری تصویریں آوٹ آف فوکس ہیں۔

کبُوتر

میرے ہونٹ
جیسے چھتری
جس پر تیرے نام کا کبوتر اترے

پرانا سوئیٹر

پہلے پہل وہ سردیوں میں خواب بنتی تھی۔
اب کچھ سالوں سے وہ ساری سردیاں سوئیٹر بنتی رہتی ہے۔

غم

غم
تیرا بچپن
جیسے ننھی بچی
رن باندھے
انجانی راہوں پر کھیلے

بارش

کھڑکی سے لگی
وہ بادل تکتی رہتی ہے
بارش کی بوندیں
اس کے دل پر گرتی ہیں
وہ آنکھیں بند کر کے
اپنے اندر موسلا دھار بارش میں بھیگتی رہتی ہے

خط

خط جیسے
فاصلوں کی مٹھی
جس میں لفظوں کے ڈاکیے
پیار کی پگڑیاں باندھے
ترے نام کا خط بانٹتے ہیں

ہمسائی

اس کی ہمسائی بہت اچھی ہے۔
وہ جب بھی اسے فون کرتا اس کی ہمسائی اسے فوراً بلا دیتی لیکن اب وہ اسے بالکل زحمت نہیں دیتی اور
جب اس کا فون آتا ہے تو اس سے خود ہی بات کر لیتی ہے۔

فضول خرچ

جب سے کسی نے اسے بتایا ہے کہ خوشی ایک اوپن چیک ہے وہ ہر روز ایک چیک کیش کروا لیتا ہے۔

تعویذ

وہ گھر سے اکثر بھاگ جایا کرتا تھا

اس کی ماں نے اسے تعویذ پہنا دیا تاکہ وہ گھر سے نہ بھاگے۔ مگر چند ہی روز بعد وہ تعویذ
اتار کر میز پر رکھ کر بھاگ گیا۔

صفائی پسند

وہ بہت صفائی پسند ہے

کوئی چیز اِدھر اُدھر نہیں پھینکتی

صاف ستھرا لباس پہنتی ہے

گھر صاف رکھتی ہے

برتن ، الماریاں اور میز پوش بھی کبھی میلے نہیں ہونے دیتی

لیکن

اپنے میلے دل کی طرف دھیان نہیں دیتی

آہٹ

وہ ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے سوتی ہے۔

پھر بھی ایک خیال جانے کس راستے سے اندر آجاتا ہے

زندگی نامہ

جب میں نے اسے پوسٹ آفس کے باہر کھڑے دیکھا تو حیران رہ گیا اور جلدی سے اس کے قریب جا کر کہا

تم تو پچھلے سال مر گئے تھے

میں نے تمہارے جنازے میں بھی شرکت کی تھی۔

جب لوگ آخری بار تمہارا منہ دیکھ رہے تھے تو میں بھی اسی قطار میں تھا۔

تمہارا چہرہ کسی کھنڈر کی طرح لگ رہا تھا۔

مگر اب تم کتنے تر و تازہ اور سمارٹ لگ رہے ہو۔

میں تمہیں دفن کرنے والوں کے ساتھ کالی بس میں بیٹھ کر قبرستان بھی گیا تھا

میرے سامنے انہوں نے تمہیں قبر میں اتارا تھا۔

انہوں نے مل کر تمہاری قبر پر مٹی ڈالی تو میں ان کے ساتھ شریک نہ ہو سکا۔

کوشش کے باوجود بھی میں آج تک کسی کی قبر پر مٹی ڈالنے کا ثواب حاصل نہیں کر سکا۔

پھر میں تمہارے قل پر بھی گیا تھا۔

جب انہوں نے تمہارے پسند کے کھانے اور کپڑوں کا ایک جوڑا ختم پڑھنے والے کے سامنے سجا کر رکھا تھا۔

اس دن بھی میں وہاں تمہارے گھر والوں کے اصرار کے باوجود کھانا نہ کھا سکا۔

مگر آج تم یہاں کیسے آئے ہو اور کس کا انتظار کر رہے ہو

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا

تم یہاں کیسے

جب کوئی تمہارے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوا اور ابھی تمہارا قتل بھی نہیں ہوا۔

اس کی باتیں

جیسے قطار میں کھڑی تیز ہوا سے گری ہوئی سائیکلیں

جوانی

ایسا ہندسہ جسے پہلی جماعت کے بچے نے لائن کے

نیچے لکھ دیا ہو۔

گرد

اسے گرد سے سخت نفرت ہے وہ ہر وقت اپنے کمرے

کی کھڑکیوں اور بک شیلف پر پڑی کتابوں کی گرد جھاڑتی

رہتی ہے اب اسے کون بتائے کہ اس کے وعدوں پر گرد کی

تہہ جم چکی ہے

تھوڑی سی چھاؤں کی نگرانی

وہ چپ اداس بیٹھی تھی
اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور اس کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے بولا
تمہارے دل میں کوئی بات ہے
اس نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور کہنے لگی
ہاں، میرے دل میں کئی باتیں تھیں۔ نئی اور خوب صورت باتیں۔
ساٹن کی نئی قمیض کی طرح ۔ چاندی کی نئی بالیوں کی طرح۔
مگر
اب کچھ سالوں سے یہ سب باتیں بالکل ایسے ہی ہو گئی ہیں جیسے
پھٹا ہوا دوپٹہ ، ٹوٹی ہوئی پرانی ' لونگ ' پھٹی ہوئی کتابیں یا کھیل کر پھینک دی گئی
گڑیاں جن سے کھیلنے والی لڑکیاں انہیں ' پڑچھتی ' پر رکھ کر دور چلی جاتی ہیں ۔

چوری کی واردات کے بعد کا قصّہ

رات وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی کمرے کی بتی جلائی اور جھنجھوڑ کر شوہر کو جگایا، کہنے لگی
اٹھو ۔جلدی اٹھو ۔ گھر میں چور ہے
اس کے شوہر نے سارا گھر چھان مارا مگر چور کہیں نہیں تھا
اس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ آرام سے سو جاؤ گھر میں چور نہیں یہ تمہارا وہم ہے
مگر وہ اپنے شوہر کو کیسے بتائے کہ چور گھر میں نہیں اس کے دل میں ہے ۔

بڑا آدمی

وہ کسی محفل میں شریک نہیں ہوتا، کسی سے ملنے نہیں جاتا
کسی کو خط نہیں لکھتا، کسی کو فون نہیں کرتا، کسی مقابلے
میں شریک نہیں ہوتا
پھر بھی لوگ ہر وقت اسے ہرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں

مظہر الاسلام ایک بے چین، پردرد، دلچسپ اور حیران کن کہانی کار ہے۔

مظہر الاسلام کی کہانیوں کا موضوع محبت، انتظار، موت اور جدائی ہے۔ اسکے افسانوں کے ہیرو عام طور پر اداس لوگ ہیں۔ وہ محبت کی تلاش میں بھٹکنے والوں، بچھڑے ہوئے لوگوں، آزادی ڈھونڈنے والوں اور روٹھے ہوئے کرداروں کی کہانیاں لکھتا ہے۔ اس نے خاکروبوں، چٹھی رسانوں، کلرکوں، مدرسوں، مزدوروں، کسانوں اور خانہ بدوشوں جیسے بے لوث کرداروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی پس منظر میں ناقابل برداشت سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مظہر الاسلام انسان کے جذبات کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور انہیں ان ہی کے راز بتا کر حیران کر دیتا ہے۔ مظہر الاسلام کی کہانیاں انگریزی، جرمن، چینی، فارسی، ہندی، گرمکھی اور سندھی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

مظہر الاسلام کی دوسری کتابیں

☆ **گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی:** مظہر الاسلام کی کہانیوں کا وہ مجموعہ جس نے اردو ادب کے قاری کو چونکا کر رکھ دیا۔ اب تک اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن قاری کو بے چین کر دینے والے اس مجموعے کی مانگ میں کبھی کمی نہیں آئی۔

☆ **باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی:** محبت اور جدائی کی لازوال کہانیوں کا وہ مجموعہ جسے محبت کرنے والے ایک دوسرے کو بطور تحفہ پیش کرتے ہیں ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے آپ یوں محسوس کریں گے کہ مظہر الاسلام نے آپ کے دل کی بات لکھ دی ہے۔

☆ **گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو:** مظہر الاسلام کی یہ کہانیاں انتہائی باریک احساس اور درد سے بنی گئی ہیں۔ ان کہانیوں کی انمٹ سچائی کو آپ کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔

☆ **اے خدا:** مظہر الاسلام نے اردو ادب میں دعا لکھنے کی ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں شاعر نہیں مگر اس کی دعائیں پڑھ کر بہت سے لوگوں نے کہا کہ وہ تو شاعر ہے۔ یہ مجموعہ قلب و دماغ کے لئے ایسی بلندیاں لئے ہوئے ہے، جسے چھونے کی تمنا ہر قاری کے دل میں ہوتی ہے۔

☆ **میں آپ اور وہ:** اس مجموعے میں شامل تحریریں پڑھ کر آپ زندگی کے کئی دلچسپ پہلو دریافت کریں گے۔ اگر آپ نے ابھی تک مظہر الاسلام کی کتابیں نہیں پڑھیں تو پڑھ کر دیکھئے آپ حیرت میں ڈوب جائیں گے۔